ISSN 0974-7346

اگست ۲۰۲۲ء

جلد ۲۰۹—عدد ۸

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۵۰۰؍روپے ہے۔

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔

اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹ | ماہ محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۲۲ء | عدد ۸

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

جمہوریت میں عوامی انتخابات کی اہمیت ظاہر ہے، خصوصاً ملک عزیز میں تو حالات جیسے بھی ہوں، یعنی وبائیں ہوں، زلزلے ہوں، سیلاب ہوں، قحط ہو، خشک سالی ہو، گرانی ہو، بے روزگاری ہو، معاشرہ کے نہایت ضروری شعبوں یعنی تعلیم وصحت اور امن وامان میں افراتفری ہو۔ حتیٰ کہ ملک کی تصویر انارکی اور طوائف الملوکی کا منظر پیش کرتی ہو لیکن جمہوریت کے گلدان میں انتخابات کے گلدستے پورے ماحول کو جشن اور تہوار میں بدل دیتے ہیں۔ اس جشن مسلسل میں نظریں دوسروں کی جانب اٹھتی بھی نہیں، لیکن ادھر چند برسوں سے امریکا اور برطانیہ جیسے ملکوں میں ایشیائی قومیں جس طرح سیاسی سطح پر نمودار ہوئی ہیں اور خاص طور پر ہندوستان سے تعلق رکھنے والے وہاں کے شہریوں نے حکومت کے اعلیٰ مناصب پر اپنی اہلیت کا دعویٰ پیش کیا اور اپنے اصل وطن یعنی ہندوستان سے محبت و الفت کے اظہار کے باوجود ان کو مقامی باشندوں کی حمایت حاصل ہوئی، اس سے قدرتاً وہاں کے انتخابات میں ہندوستانیوں کی دلچسپی کا سامان کچھ زیادہ ہی فراہم ہو گیا۔ امریکا میں کملاہیرس کے انتخاب پر ہمارے ملک کے ایک بڑے طبقہ نے اپنی ناراضی کے باوجود مسرت کا اظہار کیا، اب برطانیہ میں ایک تماشا برپا ہے، وہاں کنزرویٹیو پارٹی کے وزیراعظم بورس جانسن اپنی پارٹی اور اپنے اہم کابینی ساتھیوں کے اعتماد سے محروم ہو گئے۔ نتیجہ میں ان کو استعفیٰ دینا پڑا، ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے پارٹی میں جن لوگوں کا ذکر زور وشور سے ہوا، ان میں برطانیہ کے بعض اصل اشخاص کے علاوہ پاکستان، عراق، نائجیریا اور ہندوستان کے وہ لوگ بھی نظر آئے جو ترک وطن کے بعد برطانوی شہری بن گئے۔ بہتوں کو حیرت اسی بات پر ہوئی کہ جہاں صدیوں سے دنیا کو غلام بنانے اور سمجھنے کی ذہنیت کی حکمرانی تھی، جہاں کا رنگ اور زبان ہی "صاحبیت" کے تفوق کا اعلان تھی، قدرت کا یہ کیسا کرشمہ ہے کہ نادان بندوں کی جماعت کی جماعت، آقاؤں کی صف میں حالت قیام میں نظر آنے لگی۔ اعلیٰ قیادت کے لیے ایک قدامت پسند انگریزی سیاسی جماعت میں ایسا تنوع واقعی حیرت انگیز بن گیا، خصوصاً ہمارے ملک کے ان ذہنوں کے لیے جو ملک کی موجودہ سیاسی آب وہوا میں جمہوریت کی جگہ تعددیت کے نظریہ کو فروغ پاتے اور بے چارگی کے عالم میں جمہوریت کی قبا کو بے رنگ اور بے ڈھنگ ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ملک کا ایک بڑا طبقہ اپنے پیروں پر نظر ڈالنے کی جگہ برطانیہ کے اس رقص طاؤس سے مدہوش ہوا جاتا ہے جہاں جنگل کا سماں بتاتا ہے کہ یہ طاؤس ایک ہندوستانی نژاد بھی ہو سکتا ہے، ذرائع ابلاغ میں زیادہ شہرہ برطانیہ کے اس ہندوستانی کی لیاقت، دولت، صلاحیت کا ہے۔

اخبارات میں ایسے مضامین آنے لگے ہیں کہ ہندوستانی نژاد رشی سونک کی فتح سے ہندوستانیوں کو زیادہ خوشی ہوگی۔ خوشیوں کی توقع کے ساتھ اندیشے بھی ظاہر کیے جارہے ہیں کہ کیا واقعی کوئی ہندوستانی ''قیصر برطانیہ'' ہونے والا ہے؟ بعض کالم نگاروں نے رشی سونک کے عزائم اور منصوبوں کا موازنہ ہندوستانی وزیر اعظم کے طرز حکومت سے بھی شروع کردیا۔ بعضوں نے رشی کی اب تنہا حریف کی پالیسیوں کا مطالعہ کرکے رشی سونک کی اقتصادی منصوبہ بندی اور ایک سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کے نقش قدم کی پیروی کو ان کے عزائم کی بنیاد قرار دیا۔ کسی نے ان کی حریف کو امور خارجہ میں سابق حکومت کی غلطیوں کی تصحیح کو ان کا اصل مقصد ظاہر کیا۔ کسی نے آئیڈیولوجی (نظریہ) اور آئیڈیلزم (مثالیت پسندی) کا فلسفہ بیان کرکے گویا خواہشات نفس کو عقل و خرد کے تابع کرنے کا ہنر دکھایا، لیکن وہ اس موقع پر خود اپنی ذہنیت پر نظر کرنے سے کترا گئے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والوں کا عمل کیا رہا، بہت دن نہیں گزرے کہ برسوں سے اس ملک کو اپنا ملک بنانے والی، یہاں کے شہری کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے والی اور ایک بہترین تنظیمی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کو مکمل طور پر اپنانے والی شخصیت کو محض اس کے ماضی یا آبائی وطن کی بنیاد پر کس طرح طنز و تعریض اور انتہائی مخالفت کا نشانہ بنایا گیا اور ملک کا ضمیر اور اس کی زبان دونوں کو اظہار خیال سے احتیاط کے بہانے روک دیا گیا۔ ملک میں اس پست ذہنیت اور سطحی جذباتیت پر کوئی موثر آواز نہیں اٹھی یا اٹھنے نہیں دی گئی۔

***

شذرات میں بہ ظاہر ان عام باتوں کے ذکر کی جگہ نہیں، نہ سیاسی نظر سے کسی کی تائید یا حمایت کی بات ہے، بات صرف یہ ہے کہ آخر ہماری خوشی اور ناراضی کے اصل سوتے کہاں سے ابلتے ہیں۔ ایک جانب امریکا اور برطانیہ کی جمہوری فراخ دلی کی تحسین، دوسری جانب صدیوں سے ملک عزیز کی مٹی کی تقدیس بیان کرنے والوں اور اس سے جسم و جاں کا رشتہ جوڑنے والوں کو اجنبی بنانے کی نہایت کریہہ اور متعفن چالیں اور ان کو دیش کا دشمن بتانے کے لیے نفرت انگیز نعروں کے شور کو شر انگیز بنانے کی مستقل سازشیں اور جمہوریت کو تکثیریت کے تابع کرنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں آخر اس ملک کی ایک بڑی آبادی کو یہ فرق نظر کیوں نہیں آتا۔ ایسا نہیں کہ پورا ملک ایک خاص نظریاتی دعووں کی جماعت کا اسیر ہو چکا ہے۔ کچھ زبانیں بہر حال حق کے الفاظ سے آشنا ہیں جیسے ایک قانون داں اور سیاستداں نے لکھا کہ برطانیہ کے موجودہ منظر نامہ میں ہم ہندوستانیوں کے لیے ایک واضح سبق

ہے، کہ ہم معاشرہ کو جامع اور کھلی ذہنیت والا بنائیں، کسی کے مذہب یا ذات یا مقام کی بنیاد پر فیصلہ نہ کریں، ہماری جمہوریت اس لیے ہار جاتی ہے کہ یہاں لوگوں کی فطری صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی تو دور کی بات ہے، اسے تسلیم بھی نہیں کیا جاتا۔

***

یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بعض قوموں کی ذہنیت، بدلنے یا درست ہونے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہی رہتی ہے۔ استثنا ان میں بھی ہے لیکن بڑا حصہ ان ہی کا ہے جو انسانی معاشرہ کے اعلی ظرف کو جانتے ہی نہیں، کاش قوموں کو سمجھنے کے لیے بہت پہلے سے ان کے ظرف کا جائزہ لیا گیا ہوتا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، تقسیم ہند کے بعد ایک نجی دورہ پر پڑوسی ملک گئے تو اپنے سفر نامے میں ایک جگہ اپنے مشاہدہ میں لکھا کہ قابل ذکر یہ ہے کہ سڑکوں، تختیوں اور عمارتوں کے نام جوں کے توں ہیں۔ یہ نہیں ہوا کہ آزادی کے جوش میں آکر نزلہ غیر مسلم ناموں پر گرا ہو جو دھنی رام اسٹریٹ تھی وہ آج بھی دھنی رام اسٹریٹ ہی ہے۔ اس کو کوچہ باقی باللہ نہیں بنادیا گیا۔ جو سر گنگارام ہاسپٹل تھا وہ اس وقت بھی بدستور سر گنگارام ہاسپٹل ہی ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ اس کا نام دارالشفا جناح رکھا گیا ہو۔ بات بہ ظاہر معمولی سی ہے لیکن قوموں کے ذہنی توازن اور ملتوں کے ظرف کا اندازہ ان ہی باتوں سے ہوتا ہے۔

***

ملتوں کے ذہنی توازن اور قوموں کے ظرف کی درستی کے لیے انسانوں میں کامل ترین نمونہ، انسانیت کے سب بڑے مصلح، سب سے بڑے محسن اور اخلاقی اقدار کے سب سے بڑے پاسبان نبی آخرالزماں ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہے، موجودہ حالات میں آپ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہوگیا، اسی ضرورت کے پیش نظر سیرۃ النبی کے قریب سو سال بعد علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی کے سرچشمۂ علم و فکر سے فیضیاب ہونے والے جناب مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے تین ضخیم جلدوں اور تین زبانوں یعنی اردو، عربی، انگریزی میں محمد رسول اللہ رحمۃ للعالمین ﷺ کے نام سے ایک نئی کتابِ سیرت تیار کی۔ یہ شاندار دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، یہاں صرف مؤلف گرامی کے لیے ہدیہ تبریک و تحسین پیش ہے۔ مفصل ذکر آئندہ ان شاء اللہ کسی شمارے میں آئے گا۔

***

مقالات

حضرت شاہ ولی اللہ کا مرتب کردہ نسخۂ موطا

مولانا طلحہ نعمت ندوی

talhanemat3@gmail.com

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ نے ہندوستان میں علم حدیث کے فروغ کے لیے جو کوششیں کیں وہ مسلم ہیں، انہوں نے علم حدیث کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ نہ صرف ملکی سطح پر منفرد ہیں بلکہ پوری مسلم دنیا میں ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس ملک میں اس مبارک علم کے فروغ واشاعت کے لیے علم حدیث کی سب سے پہلی باضابطہ تصنیف حضرت امام مالک کی موطا کو بنیاد قرار دیا۔ عام طور پر محدثین امام بخاری کی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں اور علم حدیث کی سب سے اعلیٰ کتاب قرار دیتے ہیں، لیکن اس کے برعکس شاہ صاحب موطا کو اصل تسلیم کرتے ہیں، اور صحیح بخاری کو اس کے بعد، بلکہ جملہ کتب حدیث کو وہ متن موطا کی شرح قرار دیتے ہیں۔[1] ان کی رائے میں احادیث کی کتابیں، صحیح مسلم، سنن ابوداود، نسائی، جامع ترمذی اور صحیح بخاری کے فقہی مباحث (پوری صحیح بخاری نہیں) سب موطا کے مستخرجات ہیں، اور موطا ہی کے مباحث کی توسیع وتشریح ہیں، شاہ صاحب کے بقول وبالجملة فلا يمكن تحقيق الحق في هذا الباب الا بالاكباب على هذ االكتاب[2] (خلاصہ یہ کہ اس باب میں اس کتاب کی طرف پوری طرح توجہ کئے اور اس میں مشغول ہوئے بغیر تحقیق حق ممکن نہیں۔)

علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی حضرت شاہ صاحب کی اسی رائے کے قائل تھے، انہوں نے حیات مالک میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> طبقۂ اولیٰ یعنی موطا، بخاری، اور مسلم میں موطا کا کیا درجہ ہے، علمائے حدیث اس کے جواب میں مختلف الرائے ہیں، عام علماء تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بعد بھی جگہ دیتے ہیں، لیکن محققین

---

[1]۔ مقدمہ المسوی، مطبوعہ لکھنؤ، سنہ ۲۰۱۵

[2]۔ حوالہ سابق، ص ۵۱

قدماء اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں اور خود میں بھی بدء طلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں۔[۳]

موطا امام مالک کی شرح و تخریج و توضیح کا کام اس کی تصنیف کے چند دہائیوں کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کی تالیف کا زمانہ ۱۳۰ھ اور ۱۴۴ھ کے درمیان قرار دیا ہے۔[۴] اور اس سے ایک صدی کے اندر ہی اندر اس کی پہلی شرح ابن حبیب المالکی (م ۲۳۹ھ) کے قلم سے وجود میں آگئی۔[۵]

حضرت شاہ کی خدمات موطا میں ان کی شروحات کا تو ذکر کیا جاتا ہے لیکن شاید اس طرف کسی کی توجہ منعطف نہیں ہو سکی کہ شاہ صاحب نے موطا کے کسی معروف نسخے کو شرح کے لیے منتخب کرنے کے بجائے، موطا کے مشہور و متداول نسخۂ مصمودی کو (جو ان کے سامنے تھا) از سر نو مرتب کیا پھر اس کی اپنی دونوں شرحیں عربی میں مسوی مختصر اور فارسی میں مفصل و مجتہدانہ شرح مصفی تصنیف فرمائی۔

یہاں دو اہم سوالات ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ شاہ صاحب کو اس نسخہ کی از سر نو ترتیب و تبویب کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ شاہ صاحب چاہتے تو ایک مستقل کتاب اور مجموعہ حدیث اسی نہج پر تیار کر سکتے تھے؟

۲۔ شاہ صاحب نے مختصر شرح عربی اور مفصل شرح فارسی میں کیوں لکھی، جس میں اپنی اجتہادی آراء کا اظہار فرمایا، جب کہ عربی میں لکھنے سے پورے عالم اسلام کے اہل علم اس سے مستفید ہوتے اور ہندوستان کے عوام الناس کے لیے یہاں کی رائج علمی زبان فارسی میں مختصر شرح کافی تھی؟

پہلے دوسرے سوال کا جواب عرض ہے، اس کے جواب میں قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی زبان کا بھی ایک بڑا حلقہ تھا، اور ایشیائے وسطیٰ اور ایشیائے کوچک تک یہ زبان اچھی طرح سمجھی جاتی تھی، صرف عالم عربی میں اس کے جاننے والے بہت کم تھے، اور اس پورے خطہ پر فقہی جمود طاری تھا عجب نہیں کہ اسی کو ختم کرنے کے لیے شاہ صاحب نے اسی زبان میں اپنے مجتہدانہ آراء کا اظہار مناسب سمجھا جس سے وہ مانوس تھے، تاکہ شاید ان کی آراء کو قبول عام حاصل ہو۔

---

[۳]۔ حیات مالک، مطبوعہ کراچی، ص ۱۹

[۴]۔ حوالہ سابق، ص ۸۶

[۵]۔ حوالہ سابق، ص ۹۹

پہلے سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب موطا کو متن اور دوسرے مجموعہ ہائے حدیث کو اس کی شروح مانتے ہیں، اور صحیح بخاری کے برخلاف موطا کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں، اور امام مالک سے حضرت عبداللہ بن عمر اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک جو سلسلۂ زریں ہے اس کی ان کے نزدیک بہت ہی اہمیت ہے، نیز وہ اس حضرت عمرؓ اور ان کے فرزند اور امام مالک وعلمائے مدینہ کے اجتہادات سے بہت متاثر ہیں، دوسری طرف وہ امام بخاری کی فقہی دقت نظر کے بھی قائل ہیں اور ان کے تراجم ابواب اور فقہ البخاری فی تراجمہ کی معنویت سے بھی آگاہ ہیں اسی لیے انہوں نے چاہا کہ امام بخاری کا منہج ابواب موطا میں اختیار کریں اور انہی فقہی اشاروں کی بنیاد پر اس کے ابواب کی ازسرنو تبویب کریں، اور امام بخاری ہی کی طرح ترجمۃ الباب میں اپنی اجتہادی آراء کا اظہار کریں۔ نیز قرآن پاک کی بھی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اس لئے اس کی متعلقہ آیات سے ہر بحث کا آغاز کریں۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

هذا وقدشرح الله صدري-والحمدلله-أن أرتب أحاديثه ترتيبًا ليسهل تناوله،وأترجم على كل حديث بما استنبط منه جماهير العلماء،وأضم إلى ذلك من القرآن العظيم مالابد للفقيه من حفظه،ومن تفسيره مالابد له من معرفته۔[۶]

حضرت شاہ صاحب کی دونوں شروح کا تفصیلی جائزہ تو ایک مستقل مقالہ اور تفصیلی بحث کا متقاضی ہے، راقم نے ان کی عربی شرح مسوی پر ایک مضمون عربی ہی میں تحریر کیا تھا جو آن لائن رابطۃ العلماء السوریین کے سائٹ پر شائع ہو کر عام ہو چکا ہے۔ مصفی پر بھی تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، ویسے کئی لوگوں نے اپنی کتابوں میں اس پر ضمناً روشنی ڈالی ہے، چند سال قبل مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے اس کا عربی ترجمہ کیا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ شاہ صاحب نے پہلے مختصر عربی شرح لکھی تھی، پھر جب فارسی شرح لکھی تو اس کے بہت سے مباحث اور کتابوں کے اقتباسات کا فارسی میں بعینہ ترجمہ کردیا، نیز بہت سے ابواب وروایات میں بھی صرف ان کے توضیحی ترجمہ پر ہی اکتفا فرمایا، ان کے علاوہ جو اجتہادی مباحث ہیں وہ بہت زیادہ نہیں ہیں، اگر ان کو منتخب کرکے مسوی کے ساتھ ہی مرتب کردیا جائے تو ایک ہی کتاب میں یہ سارے مباحث سمٹ آئیں گے اور دو کتابوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

سردست اس مضمون میں حضرت شاہ کے مرتب کردہ اسی نسخۂ موطا اور اس کی خصوصیات پر

---

[۶] مقدمہ مسوی۔

روشنی ڈالنا مقصود ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے پیش رو شارحین موطا میں سب سے مشہور اور اولین شارح علامہ ابن عبدالبر مالکی (اندلسی) نے اپنی مشہور شرح التمہید میں موطا کو راویوں کی ترتیب پر مرتب کرکے اس کی شرح کی ہے، شاید شاہ صاحب کے پیش نظر ان ہی کا نمونہ رہا ہو۔

شاہ کی اس کی ترتیب کو مشہور فاضل و سیرت نگار جناب ڈاکٹر پروفیسر یسین مظہر صدیقی مرحوم ایک مستقل نسخہ موطا قرار دیتے تھے جس کا ان کے بقول شاہ صاحب کو حجاز کے سفر میں سراغ لگا تھا (شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث میں انہوں نے جابجا تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن یہ بات قابل قبول نہیں۔

شاہ صاحب نے اپنی مختصر عربی شرح المسوی کے مقدمہ میں اس ترتیب جدید کا منہج واضح کردیا ہے، انہوں نے اس کو مرتب ضرور کیا ہے لیکن اس میں اضافہ نہیں کیا ہے، صرف ایک دو جگہ ضرورت پڑنے پر انہوں نے خود موطا ہی کے دوسرے نسخہ سے ایک دو روایات کا اضافہ کیا ہے۔ عام طور پر انہوں نے اقوال مالک کو حذف کردیا ہے، لیکن بہت سے اقوال مالک کو باقی بھی رکھا ہے بلکہ بسا اوقات کوئی عنوان قائم کرکے اگر کوئی حدیث نہیں ملی تو قول امام مالک ہی کو متن میں پیش کردیا ہے یہ کہنا بجا ہوگا کہ شاہ صاحب نے دو تہائی اقوال امام مالک کو حذف کردیا ہے، ایک تہائی کو باقی رکھا ہے، آگے اس کی کچھ تفصیل درج کی جارہی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز بھی یہی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نے اقوال مالک اور ان کے بلاغات کو حذف کردیا ہے۔[۷] شاہ صاحب نے بھی مصفی کے مقدمہ میں مختلف مقامات پر جہال علمائے مدینہ اور امام مالک کے بلاغات کا ذکر کیا ہے، وہاں اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے، ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ امام مالک چوں کہ فقہائے سبعہ کے فتاوی اور اہل مدینہ کا تعامل ذکر کرتے ہیں اور اس موقع پر السنۃ عندنا کذا لکھتے ہیں اور ان کے بارے میں امام شافعی کا کہنا ہے کہ ان اقوال و فتاوی پر اہل مدینہ کا اجماع نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اور ان کے شیوخ کے اختیار کردہ ہیں، اسی لیے میں نے اس میں جو اقوال جمہور کے مطابق تھے انہیں ذکر کیا ہے لیکن جو امام مالک کے ساتھ مخصوص تھے انہیں ذکر نہیں کیا ہے۔[۸] اس سے شاہ صاحب کے اقوال مالک کے اخذ و ترک کا منہج واضح ہوجاتا ہے۔

۷۔ بستان المحدثین، مطبوعہ کاندھلہ، ۲۰۱۵، ص ۲۹

۸۔ المصفی شرح موطا مطبوعہ دہلی، ۱۴/۱۔

موطا کے متداول نسخۂ مصمودی کے قدیم وجدید نسخوں میں ابواب کا آغاز کتاب وقوت الصلاۃ سے ہوتا ہے، پھر مختلف ابواب ہیں، بہت سے ابواب کو جامع کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے اور اخیر میں متفرق مباحث کو کتاب الجامع کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے، بہ ظاہر یہ تقسیم وترتیب خود علامہ مصمودی کی ہے جو چوتھی یا پانچویں صدی کے مخطوطات موطا (نسخۂ مصمودی) میں بھی نظر آتی ہے، علامہ ابن عبدالبر نے اپنی شرح الاستذکار میں اس کے عناوین کو مرتب کیا تھا پھر، ماضی قریب کے مشہور صاحب ترقیم فواد عبدالباقی نے اس کی مستقل تبویب کی، جس میں بہ ظاہر الاستذکار بھی ان کے پیش نظر رہی ہے، کتاب الجامع کے عنوان سے جو کتاب تھی اس کے مباحث کو انہوں نے مستقل کتب کے عنوان سے مرتب کیا ہے، پھر وقوت الصلاۃ کے بعد عام محدثین کے منہج کے مطابق کتاب الطہارۃ کا عنوان قائم کیا ہے، جب کہ قدیم نسخوں میں کتاب وقوت الصلاۃ ہی میں طہارت کے مسائل بھی درج ہیں۔ حضرت شاہ نے ان سب کے برعکس عام محدثین کے عام طریقہ کو سامنے رکھ کر لیکن ان کی تقلید کئے بغیر گیارہ جامع ابواب/کتب میں اس کتاب کی ترتیب وتبویب جدید کی ہے، پھر ان کتب کو امام بخاری کی طرح بے شمار ابواب میں مرتب کیا ہے جن کو پیش نظر رکھ کر شاہ صاحب کے فقہ التراجم پر مستقل روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور فقہ البخاری اور اس کتاب کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

شاہ کے کتب مذکورہ اس طرح ہیں:

كتاب الصلاة، كتاب الزكاة، كتاب الصيام، كتاب الحج، كتاب البيوع والمعاملات، كتاب الفرائض، كتاب النكاح، كتاب احكام الخلافة، كتاب الاحكام المتعلقة بالطعام والشراب واللباس وغير ذلك مما يحتاج اليه الانسان فى معيشته۔ كتاب الرقائق، كتاب سير النبى ﷺ واصحابه۔

ان کتب کے تحت شاہ صاحب نے مفصل طویل طویل عناوین کے ابواب لگائے ہیں، جس سے ان کے فقہی فکر وشعور کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں مختلف ابواب کے ذریعہ اس کا ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے، پہلے ان ابواب کی تفصیل پیش کی جارہی ہے، پھر دیگر ابواب کا کچھ تذکرہ ہے جن میں اقوال مالک کا ذکر ہے۔

۱۔باب يشترط فى المسح على الخفين ان يكون ادخل رجليه فيهما وهما طاهرتان

شاہ صاحب نے ترجمۃ الباب میں اپنا مسلک بیان کردیا کہ پیر دھو کر خف پہننا چاہیے، برخلاف بہت سے فقہاء کے جن کی رائے اس سے الگ ہے۔ شاہ صاحب نے اس میں حدیث درج کرنے کے بعد قول مالک بھی ذکر کیا ہے۔

قال يحيىٰ سئل مالك عن رجل غسل قدميه ثم لبس خفيه ثم استانف الوضوء فقال ينزع خفيه ثم ليتوضا وليغسل رجليه۔

باب اذا رآی فی ثوبہ احتلاماً ولا یذکر شیئاً رآہ ماذا یفعل۔

اس باب میں شاہ صاحب کو کوئی روایت نہیں ملی اس لیے اس میں انہوں نے قول مالک ہی کو یحییٰ کے حوالہ سے درج کر دیا ہے۔

باب یتیمم لکل صلاۃ ، یہ شاہ صاحب کا قائم کردہ ترجمۃ الباب ہے، جس سے شاہ صاحب کی رائے بھی واضح ہو جاتی ہے یعنی وہ امام ابو حنیفہ کے مسلک کے بجائے امام شافعی کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں کہ ہر نماز کے لیے الگ الگ تیمم کیا جائے گا، جب کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں اگر کوئی ناقض وضوء نہیں پیش آیا ہے اور عذر باقی ہے تو ایک ہی تیمم سے کئی وقت کی نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ موطا کے نسخۂ مصمودی میں یہ روایت ھذا باب فی التیمم کے زیر عنوان تھی۔

اس میں شاہ صاحب نے قول مالک ہی کو متن بنایا ہے، شاید کوئی روایت شاہ صاحب کو موطا میں نہیں ملی۔

اگلے باب، باب من تیمم فوجد ماء وھو فی الصلاۃ لا یقطعھا میں بھی قول مالک ہی درج ہے، بلکہ دو اقوال مالک ہیں۔

یہ اقوال مالک کہیں متن میں کوئی روایت نہ ہونے کی وجہ سے لائے گئے ہیں، کہیں تشریح متن کے لیے، جس کے بغیر اس کی تفہیم ناممکن تھی، اور اسے ترک کرنا ممکن نہ تھا۔

باب المستحاضۃ تصلي وتصوم وتتوضا لکلّ صلاۃ میں شاہ صاحب نے اس کتاب میں اپنے عام معمول کے خلاف کئی روایات درج کی ہیں اور توضیح کے لئے اخیر میں قول مالک بھی درج کیا ہے: قال مالک، وقد مرّ عندنا ان المستحاضۃ اذا صلت ان لزوجھا ان یصیبھا ------الی آخرہ۔

باب الصلوات الخمس تکفر ما بینھا میں وہ روایت درج کی گئی ہے جس میں اہتمام سے وضوء کرنے اور اس پر گناہوں کے دھلنے کا ذکر ہے، یہ روایت اصل نسخہ میں باب جامع الوضوء میں تھی۔ متن میں جس آیت کی طرف اشارہ ہے اس کی توضیح و تشریح میں امام مالک کا قول درج کیا گیا ہے۔

قال یحییٰ اراہ یرید ھذہ الآیۃ : اقم الصلاۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل ،ان الحسنات یذھبن السیآت، ذلک ذکری للذاکرین۔

باب الاوقات التی یستحب فیھا اداء الصلوات الخمس وھي اوائل اوقاتھا :

اس میں ایک روایت کے بعد اس کے ایک لفظ کی تشریح بروایت امام مالک درج ہے:

قال مالک الشفق الحمرۃ التی فی المغرب ،فاذا ذھبت الحمرۃ فقد وجبت صلاۃ العشاء ،وخرجت من وقت المغرب۔

شاہ صاحب نے کتاب الحج میں عنوان قائم کیا ہے، باب ضمان قطع شجرۃ الحرم اور اس کے ذیل میں قول مالک درج کیا ہے، شاید ان کو موطا میں کوئی روایت نہیں مل سکی، یہ قول اصل نسخہ کے کتاب الحج میں جامع الفدیہ کے زیر عنوان تھا۔

اسی باب میں آگے بھی ایک روایت کے بعد ایک قول مالک نقل کیا گیا ہے، گذشتہ قول ہی کی طرح اس کی ایک سطری توضیح و تشریح ہے۔

حسب ذیل ابواب میں بھی اقوال مالک درج ہیں:

باب صفۃ الاذان قول مالک مع متن

باب من صلی فی بیتہ جماعۃ تکفیہ الاقامۃ میں قول مالک کسی روایت کے بغیر ہے، یعنی قول مالک ہی متن ہے، جیسا کہ شاہ صاحب کا معمول ہے کہ کسی اہم مسئلہ کو ثابت کرنا ہو اور موطا میں کوئی روایت نہ ہو تو وہ باب قائم کرکے قول مالک کو متن بنادیتے۔

باب التاذین للصبح في وقت السحر میں بھی قول مالک ہی متن ہے۔

باب الرخصۃ فی المرور بین یدی الصف اذا اقیمت الصلاۃ۔ اس میں اخیر میں قول مالک ہے۔ عام رائے کے برعکس شاہ صاحب بصورت مجبوری نمازی کے سامنے سے گذر جانے کی اجازت دیتے ہیں۔

باب تکبیرۃ الافتتاح میں بھی قول مالک ہی متن ہے آیت قرآنی وربک فکبر کے بعد۔

باب من قام فی اربع ساھیا--------الخ اس میں امام مالک کی کوئی روایت نہیں تھی اس لیے پہلے صحیحین کی روایت ابن مسعود کی طرف اشارہ کیا، فیہ حدیث الشیخین عن ابن مسعود۔ اس کے بعد قول مالک نقل کیا ہے۔

باب النہی فی ان یرفع الامام راسہ، اس میں ایک روایت کے ساتھ قول مالک نقل کیا گیا ہے۔

باب اذا صلی وحدہ--------الخ اس میں بھی قول مالک ہی متن ہے۔

باب یتشہد المسبوق------الخ اس میں قول مالک ہے، وھو الامر عندنا، اور ایک روایت کے بعد دوسرا قول ہے، وذلک سنۃ الصلاۃ کلھا۔

باب قضاء فائتۃ السفر۔ قول مالک متن میں درج ہے۔

باب جواز التنفل فی السفر، قول مالک درج ہے۔

باب لا جمعۃ علی مریض۔اس میں بھی قول مالک نقل کیا گیا ہے۔
اس کے بعد والی روایت میں دو اقوال مالک ہیں۔
باب استحباب استقبال الناس بالامام۔۔۔۔۔۔قول مالک متن میں۔
باب یاکل یوم الفطر۔اس میں ایک روایت کی توضیح میں مختصر قول مالک مذکور ہے۔
زکوۃ کی بحث میں بیشتر متون میں شاہ صاحب نے امام مالک کے قول ہی کو متن میں پیش کیا ہے کیوں کہ بعض جگہوں پر انہیں کوئی روایت نہیں ملی۔لیکن بیشتر اقوال مالک وہی ہیں جو کسی روایت کی توضیح کے طور پر آئے ہیں، جس میں انہوں نے اپنے یہاں اس کے معمول بہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔
اب حضرت شاہ صاحب نے کن ابواب کو کہاں رکھا ہے اس کا ایک اجمالی جائزہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے جس سے ان کی فقہی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔
شاہ صاحب کی کتاب یا ترتیب موطا کی پہلی روایت اصل کتاب میں جامع الترغیب فی الصلاۃ میں ہے۔دوسری حدیث وضوء النائم اذا قام الی الصلاۃ میں ہے۔یہاں شاہ صاحب نے خود عنوان قائم کیا ہے۔تیسری روایت جامع الوضوء میں ہے۔
موطا مصمودی میں عنوان تھا باب غسل المراۃ اذا رات فی المنام مثل مایری الرجل۔شاہ صاحب نے عنوان قائم کیا، باب اذا رات المراۃ مثل ما یری الرجل اغتسلت۔شاہ صاحب کا مسلک ان کے ترجمۃ الباب سے واضح ہے،اس میں انہوں نے حسب ذیل روایت درج کی ہے۔

> مالک عن ابن شہاب عن عروۃ بن الزبیر ان ام سلیم قالت لرسول اللہ ﷺ یا رسول اللہ المراۃ تری فی المنام مثل مایری الرجل ،اتغتسل؟ فقال لھا رسول اللہ ﷺ نعم ! فلتغتسل،فقالت لھا عائشۃ : اف لک ، وھل تری ذلک المراۃ ؟ فقال لھا رسول اللہ ﷺ تربت یمینک ومن این یکون الشبہ۔

اسی باب میں شاہ صاحب نے اسی مضمون کی دوسری روایت بھی ام سلیم ہی کے حوالہ سے نقل کی ہے جو بہ ظاہر سابق روایت کا اجمال ہے۔
موطا میں عنوان تھا باب العمل فی غسل الجنابۃ۔شاہ صاحب نے عنوان قائم کیا باب صفۃ الغسل۔اور اس میں متعدد روایات درج کی ہیں۔ایک روایت جامع غسل الجنابۃ میں تھی،شاہ صاحب نے مستقل عنوان کے تحت اس روایت کو درج کیا ہے جس میں انہوں نے اختصار کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت کر دی ہے،باب لا باس بعرق الجنب، جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حالت جنابت میں پسینہ میں شرابور ہونے اور کپڑوں کے بھیگنے کا ذکر ہے۔

قرآن پاک کو طہارت کے بغیر چھونے کی ممانعت والی روایت لا یمس القرآن الا طاھر، موطا کے کتاب القرآن، باب الامر بالوضوء لمن مس القرآن میں تھی، شاہ صاحب نے اس روایت کے لیے الگ ترجمۃ الباب قائم کیا باب لا یمس المصحف محدث ولا جنب۔

زبانی قرآن پڑھنے کی روایت باب الرخصۃ فی قراءۃ القرآن علی غیر وضوء کے زیر عنوان تھی لیکن شاہ صاحب نے اس سے زیادہ واضح اور جامع عنوان اور ترجمۃ الباب قائم کیا، باب یجوز للمحدث ان یقرا القرآن من ظھر القلب دون الجنب۔

رسول پاک علیہ السلام کے غسل کے پانی کی مقدار سے متعلق روایت موطا میں العمل فی غسل الجنابۃ میں تھی، اس کو شاہ صاحب نے مستقل عنوان کے تحت درج کیا، باب قدر ماء الغسل۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی امامت اور نمازوں کے اوقات کی تعیین کی روایت باب وقوت الصلاۃ میں تھی اس کے لیے شاہ صاحب نے عنوان قائم کیا : باب نزول جبریل علیہ السلام وتعیینہ اوقات الصلاۃ للنبی ﷺ۔ قرآن پاک کی آیت اقم الصلاۃ لدلوک الشمس اور اس کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر کی اس جملہ کی تشریح ماجاء فی دلوک الشمس وغسق اللیل میں تھی، شاہ صاحب نے ایک طویل عنوان قائم کیا باب الاوقات التی یستحبّ فیھا اداء الصلوات الخمس وھی اوائل اوقاتھا، اس سے ان کا مسلک صاف واضح ہے، اس میں بھی کئی روایات درج کی گئی ہیں جو اکثر باب وقوت الصلاۃ میں تھیں، نیز شفق کی تشریح میں قول مالک بھی درج کیا گیا ہے۔ اس باب کی ایک روایت باب ماجاء فی اقتداء الصلاۃ کی ہے۔

موطا میں النوم عن الصلاۃ کا عنوان تھا، شاہ صاحب نے وضاحت کے ساتھ اس کا عنوان قائم کیا: من نام عن صلاۃ فلیصلھا اذا ذکرھا۔ لا تعمل المطی الا الی ثلاثۃ مساجد۔۔۔۔۔۔۔۔الخ، یہ روایت موطا میں کتاب الجمعۃ، باب ماجاء فی الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ میں تھی شاہ صاحب نے مستقل عنوان کے تحت اس کو درج کیا، باب لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد، جو اس مفہوم کی روایات کے مشہور الفاظ ہیں، شاہ صاحب نے اس روایت کی توضیح میں یہ بھی فرمادیا ہے کہ خاص ثواب کی نیت سے کسی جگہ کا قصد نہیں کرنا چاہیے، بصورت دیگر کہیں جانا منع نہیں ہے۔ حج میں سر کو حلق کرانے اور اس کو طواف کے بعد تک موخر کرنے کی روایت کتاب الحج باب الحلاق میں تھی، شاہ صاحب نے اس کے لئے مستقل عنوان قائم فرمایا باب المعتمر یوخر الحلاق شیئا۔ اسی طرح کعبہ میں نماز پڑھنے کی روایت

کا عنوان موطا میں الصلاۃ فی البیت تھا لیکن شاہ صاحب کا عنوان یا ترجمۃ الباب ہے باب دخول الکعبۃ والصلاۃ فیھا۔

حج کی بیشتر روایات اصل کتاب میں جامع الحج کے زیر عنوان تھیں شاہ صاحب نے سب کے لیے الگ الگ عناوین قائم کئے، اور ان مسائل کو اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے، چنانچہ باب المواضع المتبرکۃ بمکۃ وغیرہ۔زیارت روضۂ نبوی علی صاحبھا السلام کی روایت کتاب الحج میں نہیں تھی، اسی طرح زیارت قبا کی بھی روایت نہیں تھی، شاہ صاحب نے، سجود سہو کے مباحث جامع السھو سے ان روایات کو اٹھا کر یہاں درج کیا، وہاں عنوان تھا باب ما جاء فی الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں شاہ صاحب نے تحریر فرمایا، باب زیارۃ قبر النبی ﷺ۔اسی طرح وہاں عنوان تھا العمل فی جامع الصلاۃ، شاہ صاحب کا عنوان ہے باب اتیان قباء۔

موطا مصمودی کا عنوان تھا، جامع ماجاء فی امر المدینۃ، شاہ صاحب نے لکھا، باب حرم المدینۃ حرسھا اللہ تعالیٰ، اس باب میں شاہ صاحب نے دو روایتیں درج کی ہیں جن میں ایک اصل موطا میں ما جاء فی تحریم المدینۃ کے زیر عنوان تھی۔یہ طریقہ شاہ صاحب کے منہج کے خلاف ہے، وہ عام طور پر ایک باب کی روایتوں کو الگ الگ تو عناوین کے تحت درج کرتے ہیں لیکن دو الگ الگ ابواب کی روایات کو ایک ساتھ نہیں ذکر کرتے۔

شاہ صاحب کے یہاں نماز کے ساتھ وضو میں بھی نیت ضروری ہے، وہ اس مسئلہ میں حنفیہ کے بجائے امام شافعی کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں اسی لیے انہوں نے مصفی میں اس موضوع پر بہت تفصیلی بحث کی ہے، اور اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے، اس مسئلہ کی اہمیت شاہ صاحب کے یہاں اس قدر ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے وعدہ اور منہج کے خلاف موطا مصمودی میں جب انہیں نیت کی روایت نہیں ملی تو موطا محمد، اور قتیبہ و قعنبی کے نسخوں سے یہ روایت اخذ کر کے درج کی ہے۔

یہ روایت موطا محمد وقتیبہ والقعنبی باب تجب النیۃ فی ابتداء الصلاۃ میں ہے۔یہاں شاہ صاحب کو کوئی روایت نسخۂ یحییٰ میں نہیں ملی، اس لیے لکھا ہے، وروی مالک باسنادہ فی غیر روایۃ یحییٰ۔اور انما الاعمال بالنیات والی روایت نقل کی ہے، گویا امام بخاری ہی کی طرح انہوں نے مستقل ترجمۃ الباب قائم کر کے اس میں دقیق اشارے فرمائے ہیں، کیوں کہ شاہ صاحب کے یہاں نیت کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے، اور وہ امام شافعی کی طرح نیت کو وضو کے لیے بھی واجب قرار دیتے ہیں چہ جائیکہ نماز کے لیے۔

حضرت شاہ صاحب نے اقوال مالک کو حذف کرنے، اور تمام روایات موطا کو درج کرنے کا ذکر کیا

ہے لیکن مولانا عبید اللہ سندھی نے، جو شاہ صاحب کے علوم کے اہم شارحین میں ہیں، باب جمع العصرین والعشائین لمن بہ عذر میں نمبر ۱۴۰ میں حضرت زید بن اسلم کی مرسل حدیث نقل کی گئی ہے، اس کے بارے میں حاشیہ میں مولانا کا یہ قول نقل کیا ہے:

قال الشیخ المؤلف : قد استوعب احادیث الموطا وآثارہ فی ھذہ النسخۃ ،ولکن بعد التفحص ماوجدنا روایۃ زید بن اسلم في نسخ المسوی، انما ذکر الشیخ اختصارھا فی باب الاقامۃ للفائتۃ فاضفنا فی ھذاالباب مرسل زید کما وقع فی روایۃ یحییٰ بن یحییٰ۔[9]

ممکن ہے کہ جو نسخے مرتب کے سامنے رہے ہوں ان میں یہ کمی ہو۔

حضرت شاہ صاحب نے صحیح روایات کی روشنی میں مسائل کی تخریج واستنباط اور موطا کی طرف علماء کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اتنی محنت کی ہے، لیکن امام بخاری کی طرح انہوں نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے لیے ایک ہی حدیث کئی جگہ ذکر کی ہو ایسا نہیں نظر آتا، اگر شاہ صاحب ایسا کرتے تو مزید مسائل ومباحث کی توضیح کر سکتے تھے، لیکن انہیں موطا کی صحیح روایات اور عمل اہل مدینہ کا دائرہ میں رہ کر ہی تشریح وتوضیح کرنی تھی، اور ایک صحیح کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں دینی تھی، اس لیے نہ انہوں نے کسی روایت کو حذف کیا اور نہ کسی روایت کو مکرر لا کر مباحث کو وسعت دینے کی ضرورت سمجھی، صرف نیت کی روایت اصل کتاب میں دوسرے نسخہ ہائے موطا سے اضافہ ہے، اس لیے اس کو بڑے اہتمام سے وضو اور نماز دونوں بحثوں میں ذکر کیا ہے۔

یہ کتاب شاہ صاحب کے طریقہ خاص کی مظہر بھی ہے، جس کا انہوں نے اپنی تحریروں میں مختلف مقامات پر اشارہ فرمایا ہے کہ انہیں محدثین وفقہاء کی جامعیت کا ایک نیا منہج الہام ہوا ہے۔[10]

یہ شاہ صاحب کے مرتب کردہ نسخۂ موطا کا ایک اجمالی تعارف ہے اور اس کے سرسری جائزہ پر اکتفا کیا گیا ہے، اگر مکمل استیعاب کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب کے فکر ونظر کے بہت سے گوشے وا ہوں گے۔

---

[9] حوالہ سابق، ص ۹۰

[10] حضرت شاہ صاحب نے اپنی کتابوں، مصفی، عقد الجید اور تفہیمات الٰہیہ کے علاوہ اپنی دیگر تحریروں میں بھی جا بجا اس پر روشنی ڈالی ہے۔

برصغیر میں تصنیف شدہ صوفیہ، علما، اطبّا اور خوشنویسوں کے فارسی تذکروں کی ایرانی اشاعتیں

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد، پاکستان

naushahiarif@gmail.com

صوفیہ کے تذکرے*:

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار*، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، تصحیح و توضیح علیم اشرف خان، ناشر: انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ۱۳۸۴ش / ۲۰۰۵ء، یہ کتاب کے مرتّب کا شعبۂ فارسی دہلی یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے۔ اس میں انھوں نے تین قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد دکن شمارہ TS494 مکتوبہ ۱۰۸۰ھ؛ دارالعلوم دیوبند مکتوبہ ۱۰۱۴ھ؛ کتابخانۂ ہر دیال دہلی شمارہ ۳۶۳ مکتوبہ ۱۱۲۶ھ۔ مرتب نے حاشیے میں کہیں کہیں توضیحات لکھی ہیں۔ تعلیقات کا الگ سے کوئی اہتمام نہیں ہے۔ آخر میں اشاریے موجود ہیں۔ توفیق سبحانی نے مختصر تقریظ لکھی ہے جس میں کتابت کی بے شمار اغلاط ہیں۔ جیسے مظفر حسین صبا کو صہبا (ص شش)، سید عبدالقادر تتوی کو تقوی (ایضاً)، فرہنگ زفان گویا کو زمان گویا (ایضاً)، حسن علا سجزی کو محسن علا (ص ہفت)، تاریخ حقی کو تاریخ محقی (ایضاً) لکھا ہے۔

تاریخ تصوف در ہند، اطہر عباس رضوی[1]

تاریخ تصوف در ہند جلد اول*، سید اطہر عباس رضوی، ترجمہ منصور معتمدی، ناشر: مرکز نشر دانشگاہی،

---

* ایک ستارے کی علامت سے مراد ہے کہ یہ کتاب مضمون نگار کے پاس موجود ہے. دو ستارے کی علامت سے مراد ہے کہ مضمون نگار نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔

[1] کتاب کے مصنف اصلاً ہندوستانی تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ بعد میں اسٹریلیا چلے

تہران، ۱۳۸۰ش / ۲۰۰۱ء، یہ مصنف کی دو جلدوں پر مشتمل انگریزی تصنیف *A History Of Sufism In India* (شائع کردہ منشی رام منوہر لال پبلشرز، دہلی، ۱۹۷۸ء) کی پہلی جلد کا فارسی ترجمہ ہے۔ جو آغاز تصوف اور ہندوستان میں مختلف سلاسلِ تصوف کے بارے میں ہے۔ راقم السطور نے اس ترجمے پر الگ سے تبصرہ شائع کیا ہے جس میں اس ترجمے کی خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔[۲]

تاریخ کبیر کشمیر الموسوم بہ تحایف الابرار فی ذکر اولیاء الاخیار، ابو محمد حاجی محی الدین متخلص بہ مسکین کشمیری

تحایف الابرار فی ذکر اولیاء الاخیار (در ذکر احوال و کرامات عرفای ہند)*، ابو محمد مسکین بن محی الدین الحنفی الکبروی سرہندی، بہ کوشش عیوض ہوشیار، یوسف بیگ باباپور، ناشر: مکتب اسنوند، مراغہ، ۱۳۹۵ش / ۲۰۱۶ء۔ یہ کشمیر کے سادات، رشیوں، مشایخ و صلحا، علما و فضلا، مجاذیب، شعرا کا تذکرہ ہے جو ۱۳۱۰ تا ۱۳۲۱ھ (۱۸۹۲ تا ۱۹۰۴) تصنیف ہوا اور پہلی بار مصنف کے بھائیوں مولوی احمد شاہ واعظ اور عبد الغنی کے اہتمام سے مطبع سورج پرکاش، امرتسر سے ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳-۱۹۰۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ ایرانی مرتبین نے اسی اشاعت کو بنیاد بنایا ہے، اگرچہ اس کے بارے میں صرف "نسخہ چاپ سنگی ہند" لکھا ہے (ص ۶) اور ہندی اشاعت کی کوئی تفصیل نہیں دی۔ ایرانی مرتبین نے کئی مقامات پر حذف و تعدیل سے کام لیا ہے بالخصوص جہاں مصنف نے شیعہ عقاید پر گرفت کی ہے، مرتبین نے اسے نکال دیا ہے (برخی مباحث تعصبی آن را در حق اہل تشیع حذف یا تعدیل کردیم، ص۶)۔ جہاں جہاں سے مرتبین سے عبارتیں نہیں پڑھی گئیں یا مقامی نام ان کے لیے غریب تھے، وہاں نقطے لگادیئے ہیں۔ قراءت متن کی بے شمار اغلاط موجود ہیں۔ سپاس بیقیاس کو سپاس بہ قیاس، منصبۂ ظہور کو منصبہ ظہور لکھا ہے (ص۹)۔ اشخاص، کتب اور جگہوں کے نام ٹھیک طور سے نہیں پڑھے گئے۔ شیخ محمد مراد ٹنگ کو محمد مراد بنگ، عبد الصبور کو عبد القبور (ص ۱۲)، زبدۃ الاخبار کو زبدۂ

گئے اور وہاں کی شہریت حاصل کرلی۔ ۱۹۹۴ء میں وہ تہران آئے اور زیارت کے لیے مشہد گئے ہوئے تھے کہ اچانک وفات پاگئے اور وہیں دفن ہوئے۔

[۲] دیکھیے: نشر دانش، تہران، سال نوزدہم، شمارہ ۳، شمارہ مسلسل ۱۰۲، پاییز ۱۳۸۱ش / ۲۰۰۲ء، ص ۶۷-۷۷

الخبار، مخزن کشمیر کو محزن یمن کشمیر، بکرمی سال کو بہ کرمی سال (ص ۱۳)، خواجہ قاسم ترمذی کی نسبت ترندی اور شیخ نور محمد آفتاب رعناواڑی کی نسبت رعناداری ہو گئی ہے (ص ۴۹۳)۔ مصنف کا نام جو ابو محمد محی الدین مسکین ہے سرورق پر اسے ابو محمد مسکین بن محی الدین لکھ دیا ہے۔ مصنف کی وابستگی شیخ احمد سرہندی سے ہے جسے مرتبین نے شیخ احمد یسوی بنا دیا ہے (ص ۵)۔ آب و دانہ کو آب ولانہ (ص ۸۵۰) لکھا ہے۔ ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے کہ ''در شہر لاہور بہ مقام باغبان پورہ از خدمت پیر عبداللہ شاہ پیشاوری مستفید گردیدم'' (طبع امرتسر) جسے ایرانی مرتبین نے ''در شہر لاہور مقام یافت واز خدمت پیر۔۔۔ الی آخر'' پڑھا ہے (ص ۸۵۱)۔ ہندوستان میں معمول کچھ اوراد و وظائف ایرانی مرتبین کے لیے بالکل ناآشنا ہیں اسی لیے ان کے نام غلط سلط لکھے ہیں۔ درود حضور کو ورود و حضور، حزب البحر کو حرب البحر لکھا ہے (ص ۸۵۱)۔ مصنف نے سنین بڑی احتیاط کے ساتھ اعداد کی بجائے عبارتوں میں لکھے تھے تاکہ غلطی کا احتمال نہ رہے لیکن ایرانی مرتبین نے سنین کی عبارتوں میں درمیان سے ایک لفظ چھوڑ دیا ہے جس سے تاریخ مسخ ہو گئی ہے جیسے: مصنف نے اپنا سال ولادت ''یک ہزار و دو صد و ہشتاد و دو'' لکھا ہے (طبع امرتسر، ص ۳۶۳) ایرانی اشاعت میں صرف ''ہزار و دویست و ہشتاد'' چھپا ہے (ص ۸۵۰)۔ مصنف نے اپنے والد کی وفات ''در سنہ یک ہزار و سہ صد و ہفت'' لکھی ہے (طبع امرتسر، ص ۳۶۴) جو ایرانی اشاعت میں ہزار و سی صد و ہفت ہو گئی ہے (ص ۸۵۲)۔ مصنف نے اپنی کتاب عین الجاری شرح اربعین القاری کا سال تصنیف ''یک ہزار و سہ صد و نہ'' لکھا تھا (ایضاً) جسے ایرانی اشاعت میں ''ہزار و سی صد و نہ'' لکھا ہے یعنی ایک کا عدد چھوڑ دیا ہے اور سہ کو سی بنا دیا ہے۔ اتنی ضخیم کتاب جس میں سینکڑوں رجال، کتب اور مقامات کے نام ہیں کسی قسم کے اشاریے کے بغیر ہے۔ امرتسر اشاعت کے آخر میں کتاب میں مذکور رجال کی ایک جامع فہرست ہے جس سے کم از کم کسی شخص کا نام تلاش کرنے میں مدد مل جاتی ہے لیکن ایرانی اشاعت میں کسی قسم کی کوئی فہرست نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ اس کتاب میں کس کس کا ذکر ہوا ہے۔ غرض ایک نہایت ہی عمدہ ہندوستانی تصنیف کو ایرانی مرتبین نے بالکل مسخ کر دیا ہے اور ۸۵۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب سے آپ کوئی نام تلاش نہیں کر سکتے۔

ثمرات القدس مِن شجرات القدس، میرزا لعل بیگ لعلی بدخشی

ثمرات القدس مِن شجرات القدس*، میرزا لعل بیگ لعلی بدخشی، مقدمہ، تصحیح و تعلیقات سید کمال حاج سیّد جوادی، ناشر: پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، تہران، ۱۳۷۶ش، ۱۹۹۶ء؛ اس کا سال

تالیف تقریباً ۱۱۰۱ھ ہے۔ تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف برّصغیر کے صوفیہ کے حالات پر مبنی ہے۔ اس کی اشاعت میں پاکستان کے دو قلمی نسخوں (قومی عجائب گھر پاکستان، کراچی؛ مولانا نصرت نوشاہی، شرق پور) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ خود کتاب میں مصنف کے ذاتی حالات پر بے شمار اشارات موجود ہیں لیکن مرتّبِ تذکرہ نے ان سے قطعاً کوئی اعتنا نہیں کیا اور مصنف کے حالات کی جستجو کیے بغیر مقدمہ لکھ دیا ہے۔ آخر میں تعلیقات اور اشاریے موجود ہیں۔

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری

خزینۃ الاصفیا، غلام سرور سرور لاہوری، بکوشش بہداد اربابی، ناشر: منشور امید، ۱۳۸۳ ش/ ۲۰۰۴ء، یہ اشاعت راقم السطور نے نہیں دیکھی صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ کسی ہندوستانی اشاعت کا عکس ہے۔ خزینہ مطبع ہوپ، لاہور (۱۲۸۴ھ)، مطبع ثمر ہند، لکھنو (۱۲۹۰ھ) اور مطبع منشی نول کشور، کانپور (۱۸۹۴، ۱۹۰۲، ۱۹۱۴ء) میں طبع ہو کر شائع ہوئی تھی۔

ذکر جمیع اولیای دہلی، حبیب اللہ بن شیخ جہان اکبر آبادی دہلوی

ذکر جمیع اولیای دہلی**، حبیب اللہ، بہ کوشش یوسف بیگ باباپور و مسعود غلامیہ، ناشر: منشور سمیر، تہران، ۱۳۹۵ش/ ۲۰۱۶ء، یہ تذکرہ پہلے ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے مرتب کیا تھا اور ۸۸-۱۹۸۷ء اور ۲۰۱۵ء میں عربیک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، ہندوستان سے دوبار چھپ چکا ہے۔ یہ ایرانی اشاعت اسی پر مبنی ہے لیکن مرتبین کی ''یادداشت'' میں اسے پاکستان کی اشاعت بتایا گیا ہے: چندی پیش ھمین تذکرہ در پاکستان (مرکز تحقیقات زبان فارسی) بہ چاپ رسیدہ بود۔۔۔ دستمایۂ ما در این احیا ھمان چاپ پاکستان بودہ است۔ یعنی کچھ عرصہ پہلے یہ تذکرہ پاکستان میں مرکز تحقیقات زبان فارسی سے چھپا تھا اور ہماری اشاعت اسی پاکستانی اشاعت کا احیاء ہے۔ غالباً مرتبین کو نہیں معلوم کہ ٹونک ہندوستان کی ریاست راجستھان میں ہے۔ تعجب ہے انھوں نے اصل مرتب ڈاکٹر شریف حسین قاسمی کا کہیں نام نہیں لیا جن کی مرتّبہ کتاب سے انھوں نے اپنے نام سے کتاب تیار کی ہے۔ کتاب کے شروع میں مذکور اولیا کی فہرست درج ہے لیکن آخر میں کسی قسم کا مزید اشاریہ نہیں ہے۔

سیر الاقطاب، الہدیہ بن عبدالرحیم چشتی کیرانوی

خواجگان چشت: سیر الاقطاب، مجموعہ زندگی نامہ ہاے مشائخ چشتیہ*، شیخ اللہ دیہ بن شیخ عبدالرحمان چشتی، مقدمہ، تصحیح، فہرست ہاوتوضیح از: محمد سرور مولایی، ناشر: نشر علم، تہران، ۱۳۸۶ش، کتاب کے مرتب افغانستان کے ہیں لیکن ایران میں مستقل سکونت رکھتے ہیں۔اپنے پیش گفتار میں انھوں نے یہ تو بتایا ہے کہ سیر الاقطاب پہلی بار ۱۳۰۶ھ / ۱۸۷۷ء میں مطبع نول کشور لکھنو سے چھپی اور اسی مطبع سے چوتھی بار ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء میں طبع ہوئی لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کی بنیاد کس اشاعت پر ہے۔چونکہ کسی قلمی نسخے کی طرف بھی اشارہ نہیں کیااس لیے گمان غالب ہے کہ کسی نول کشوری اشاعت کو ہی سامنے رکھا ہے۔مرتب نے ایک مقدمہ اور چند اشاریوں کا اہتمام کیا ہے۔

سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی دہلوی

مرآت المعانی بہ انضمام گزیدہ سیر العارفین*، جمالی دہلوی، بہ تصحیح و با مقدمہ نصر اللہ پور جوادی، ناشر: انتشارات حقیقت، تہران، ۱۳۸۴ش، سیر العارفین ہندوستانی اولیا کا مفصل تذکرہ ہے جو مطبع رضوی دہلی، ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء سے چھپا تھا، یہ ایرانی اشاعت اسی پر مبنی اور تلخیص ہے۔اس ملخص میں بہاالدین زکریا ملتانی، فخر الدین عراقی، امیر حسینی ہروی، حسن افغان، سفر مولف بہ ہرات و دیدار با عبدالرحمان جامی، حمید الدین ناگوری، سماءالدین دہلوی کے حالات شامل ہیں۔اشاریہ نہیں ہے۔اس تلخیص کے ساتھ جمالی کی ایک فارسی مثنوی مرآت المعانی مکمل شائع ہوئی ہے۔

سکینۃ الاولیا، محمد داراشکوہ

سکینۃ الاولیا*، محمد داراشکوہ فرزند شاہ جہان، بکوشش تاراچند و سید محمد رضا جلالی نائینی، ناشر: موسسہ مطبوعاتی علمی، تہران، [۱۹۶۵ء/ ۱۳۴۴ش]، مصنف کے حالات میں مقدمہ اور اشاریے ہیں۔یہ حضرت میاں میر لاہوری اور ان کے اصحاب کا تذکرہ ہے۔

کشف المحجوب، ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری غزنوی مشہور بہ داتا گنج بخش لاہوری

کشف المحجوب، علی بن عثمان ہجویری، بہ تصحیح و مقدمہ والنتین ژوکوفسکی، بہ اہتمام محمد عباسی، موسسہ مطبوعاتی امیر کبیر، تہران، طبع اول، ۱۳۳۶ش / ۱۹۵۷ء، کتاب کا ایک حصہ تصوف کے مسائل پر اور

ایک حصہ اولیااللہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ لینن گراڈ اشاعت (۱۹۲۶ء) کا عکس ہے۔ مرتب نے اس پر روسی مقدمہ لکھا تھا، ایرانی اشاعت میں اس کا فارسی ترجمہ کیا گیا ہے۔ مرتب نے ویانا اسٹریا کا نسخہ مخطوطہ شمارہ ۳۳۴، اساس قرار دے کر دیگر چار نسخوں سے تقابل کیا ہے۔ یہ کشف المحجوب کی پہلی تنقیدی اشاعت ہے۔

کشف المحجوب، بہ تصحیح علی قویم، ناشر: تہران، ۱۳۳۷ش/ ۱۹۵۸ء، یہ اشاعت مہدی قلی ہدایت (ایران) کے کتب خانے کے قلمی نسخے پر مبنی ہے۔

کشف المحجوب**، ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی الہجویری الغزنوی، تصحیح و۔ ژوکوفسکی، بامقدمہ قاسم انصاری، ناشر: کتابخانۂ طہوری، تہران، طبع سوم ۱۳۵۸ش/ ۱۹۷۹ء؛ طبع چہارم ۱۳۷۵ش/ ۱۹۹۶ء، مرتبہ ژوکوفسکی مطبوعہ لینن گراڈ کا عکس ہے۔ اس پر قاسم انصاری کاالگ سے فارسی مقدمہ بھی ہے۔

کشف المحجوب*، علی بن عثمان ہجویری، مقدمہ، تصحیح و تعلیقات محمود عابدی، ناشر: سروش، تہران، طبع اول ۱۳۸۳ش، یہ اشاعت ویانا کے شاہی کتب خانے کے مخطوطہ شمارہ ۳۳۴ پر مبنی ہے اور مزید چند نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ مرتب نے بہت عمدہ مقدمہ، تعلیقات اور اشاریوں کا اہتمام کیا ہے۔ کشف المحجوب کی اب تک کی اشاعتوں میں سے مرجح ہے۔

گلزار ابرار فی سیر الاخیار، محمد حسن بن موسی غوثی شطاری ماندوی

گلزار ابرار فی سیر الاخیار (در شرح احوال عرفا و مشائخ ہند)*، محمد حسن بن موسی غوثی شطاری ماندوی، با مقدمہ و تصحیح یوسف بیگ باباپور، ناشر: موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، و انتشارات سفیر اردہال، تہران، ۱۳۹۱ش/ ۲۰۱۲ء، یہ صرف برّصغیر کے مشائخ کا بہت علمی تذکرہ ہے۔ مصنف ۱۰۱۰ھ تا ۱۰۲۱ھ اس کی تصنیف میں مصروف رہے۔ یہ اشاعت دو قلمی نسخوں اور ایک مطبوعہ پر مبنی ہے۔ قلمی سالار جنگ میوزیم حیدرآباد دکن (شمارہ ۸۶۰)، گنج بخش اسلام آباد (شمارہ ۱۲۷۹۹) اور مطبوعہ مرتبہ ڈاکٹر محمد ذکی، خدابخش لائبریری، پٹنہ، طبع اول ۱۹۹۴ء طبع دوم ۲۰۰۱ء۔ مطبوعہ کے بارے میں ایرانی مرتب کا کہنا ہے: ''اغلاطی در متن وارد شدہ کہ چشمگیر است'' (ص پنجاہ وسہ) یعنی اس میں نمایاں اغلاط ہیں۔ ایرانی مرتب کے اپنے مقدمے میں کئی اغلاط ہیں۔ سیر الاولیا کے مصنف کا نام میر خورد گی؟، فواید الفواد کے مصنف کا نام حسن سجزی کی بجائے حسین سجزی، سیر العارفین کے مصنف کا نام شیخ جمالی کی جگہ شیخ جمال، سلسلۃ العارفین کے مصنف مولانا محمد قاضی کا نام مولانا محمد قانعی،

تکملہ کو تکلمہ لکھا ہے (ص پنجاہ و دو)۔ کچھ تاریخی کتابوں کے مصنفین کے نام بھی ادل بدل کردیئے ہیں۔ طبقات ناصری کو ضیاءالدین برنی (بجاے منہاج سراج) اور تاریخ فیروز شاہی کو محمد بہاء مغانی (بجاے ضیاالدین برنی) کی تصنیف لکھا ہے (ص پنجاہ و سہ)۔ مرتب نے آخر میں چند اشاریوں کا اہتمام کیا ہے۔

مخبر الواصلین، ابو عبداللہ محمد فاضل مدعو بہ مظہر الحق ترمذی اکبر آبادی

مخبر الواصلین*، محمد فاضل ترمذی اکبر آبادی، تصحیح و تحقیق مہر داد اکبری، ناشر: انتشارات ابوالحسنی، قم، ۱۳۹۷ش / ۲۰۱۸ء؛ کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے سال تصنیف ۱۰۶۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ خلفا، صحابہ، آئمہ، اولیا اور مصنف کے خاندان کے صلحا کا منظوم تذکرہ ہے۔ جس میں ان کی وفات کے لیے مادہ ہاے تاریخ وفات کا اہتمام کیا ہے۔ مرتب نے دو قلمی نسخوں اور ایک مطبوعہ نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ ایک قلمی نسخہ آستان قدس رضوی مشہد نمبر ۳۱۶۴۷؛ ایک مکتوبہ ۱۱۶۷ھ جس کے بارے میں نہیں بتایا گیا کہ کہاں ہے۔ مرتب نے مطبوعہ نسخہ دہلی ۱۲۴۹ھ بتایا ہے جب کہ یہ کلکتہ کا چھپا ہوا ہے۔ اس کتاب کی دو اور ہندوستانی اشاعتیں بھی ہیں، ایک ۱۲۶۵ھ لکھنو اور دوسری ۱۳۸۵ھ دہلی۔ ایرانی اشاعت کے آخر میں تعلیقات اور اشاریے تو ہیں لیکن کسی ایک اشاریے کی بھی متن کے صفحات کے ساتھ مطابقت نہیں ہے۔

منتخب التواریخ، عبدالقادر بدایونی

منتخب التواریخ*، عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، بہ تصحیح مولوی احمد علی صاحب، با مقدمہ و اضافات توفیق سبحانی، ناشر: انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ۱۳۷۹ش / ۲۰۰۲ء، یہ دراصل منتخب التواریخ کی کلکتہ اشاعت ۶۹-۱۸۶۴ء مرتّبہ منشی احمد علی، کبیر الدین احمد، ولیم ناسو لیس، جلد سوم پر مبنی ہے جو مشایخ، فضلا، اطبا، شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ ایرانی مرتّب یا ناشر نے سرورق پر کسی جلد شمار کا اظہار نہیں کیا ہے اور اسے محض منتخب التواریخ نام سے شائع کیا ہے۔ سرورق پر ایرانی مرتّب کی طرف سے ''با مقدمہ و اضافات'' سے مراد چار صفحات کا تعارفی مقدمہ و آخر میں ہندی یا اردو الفاظ کی فارسی فرہنگ ہے۔ نیز اشاریوں کا اضافہ کیا ہے۔

مفتاح التواریخ، طامس ولیم بیل (Thomas William Beal)

مفتاح التواریخ*، توماس ویلیام بیل، تصحیح و تحقیق مہر داد اکبری، ناشر: انتشارات ابوالحسنی، قم، ۱۳۹۸ش / ۲۰۱۹ء، ۲ جلد؛ انگریز مصنف ہندوستان میں رہا ہے اور ۱۸۷۵ء میں آگرہ میں وفات پائی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۴ء (۱۸۴۸ء) میں تصنیف ہوئی۔ اس کی اولین اشاعت ۱۸۴۸ میں مطبع مطلع الاخبار آگرہ میں شروع ہوئی اور فروری ۱۸۴۹ء میں مطبع اسعد الاخبار آگرہ میں
ختم ہوئی۔ دوسری اشاعت مطبع نول کشور کانپور میں ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) میں ہوئی۔ کتاب میں صحابہ، خلفا، اولیا، سلاطین، شعرا اور دیگر کئی لوگوں کے حالات اور قطعات تاریخ وفات ہیں۔ بعض قطعات تاریخ دوسری مناسبتوں سے بھی ہیں۔ ایرانی مرتب نے نول کشوری اشاعت (۱۲۸۴ھ) کو نقل کیا ہے اور بقول ان کے ادبی اور تاریخی متون سے واقعات کی مطابقت کی ہے۔ آخر میں تعلیقات ہیں لیکن اشاریہ نہیں ہے۔

علماء کے تذکرے:

آئینہ حق نما، تلامذۂ سید دلدار علی نقوی

آئینہ حق نما، تالیف برخی از شاگردان غفران مآب بہ سال ۱۲۳۱ھ، بہ همراه نُہ رسالہ و مکتوب دیگر، تحقیق وتدوین علی فاضلی، ناشر: موسسہ کتاب شناسی شیعہ، قم، یہ ہندوستانی شیعہ عالم سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی غفران مآب (م: ۱۲۳۵ھ) کا تذکرہ ہے جو ان کے بعض شاگردوں کا لکھا ہوا ہے۔

تاریخ اجتماعی - فکری شیعہ اثنا عشری در ہند، سید اطہر عباس رضوی

یہ مصنف (۱۹۲۱-۱۹۹۴ء) کی دو جلدوں میں انگریزی کتاب *A Socio-intellectual history of the Isna 'Asharishi'is in India* (مطبوعہ اسٹریلیا و دہلی، ۱۹۸۶ء) کا فارسی ترجمہ ہے۔
تاریخ اجتماعی - فکری شیعہ اثنا عشری در ہند، مترجمین: منصور معتمدی و عبدالحسین بینش، ناشر: پژوہشگاہ علوم و فرہنگ اسلامی، قم، ۱۳۹۷ش / ۲۰۱۸ء

تذکرۃ العلماء المحققین فی آثار الفقہا والمحدثین، دیکھیے: ورثۃ الانبیا

تذکرہ علمائے امامیہ پاکستان، سید حسین عارف نقوی

تذکرہ علمای امامیہ پاکستان**، سید حسین عارف نقوی، ترجمہ محمد ہاشم،، ناشر: بنیاد پژوہش ہای اسلامی آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۷۰ش / ۱۹۹۱ء، یہ پاکستانی مصنف سید حسین عارف نقوی (۱۹۴۲-۲۰۱۲ء) کی اسی نام سے اردو کتاب (مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء) کا فارسی ترجمہ ہے جس میں معاصر پاکستانی شیعہ رجال کا تذکرہ ہے۔ آخر میں اشاریوں کا اہتمام ہے۔

تذکرہ علمائے کشمیر، سید محسن حسینی کشمیری

تذکرہ علمای کشمیر**، سید محسن حسینی کشمیری؛ بہ کوشش یوسف بیگ باباپور، ناشر: سفیر اردہال، تہران، ۱۳۹۲ش۔ یہ مصنف کی اردو کتاب دانشنامہ شیعیان کشمیر** مطبوعہ مرکز احیاء آثار برصغیر، کراچی ۲۰۱۱ھ کی پہلی جلد سے کشمیری شیعہ علما کے حالات کا ترجمہ اور انتخاب ہے۔ اصل اردو کتاب میں ۲۳۶ شخصیات کا ذکر ہے۔ فارسی ترجمے میں قدیم زمانے سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک کی ۱۵۳ شخصیات کا انتخاب کیا گیا ہے اور معاصر یا پندرہویں صدی کی شخصیات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مترجم کے نام کی سرورق پر صراحت نہیں ہے۔ مرتب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ جلیلہ شہیدی نے ترجمے میں ان کی مدد کی (ص ۱۲)۔ کتاب اشاریے کے بغیر ہے۔

تذکرہ علمائے ہند، محمد عبدالشکور معروف بہ رحمان علی

تذکرہ علمای ہند (تحفۃ الفضلا فی تراجم الکملا)* ، محمد عبدالشکور ریوانی معروف بہ رحمان علی صاحب بن شیر علی احمد آبادی، بہ کوشش یوسف بیگ باباپور، ناشر: مجمع ذخائر اسلامی، چاپ اول، ۱۳۹۱ش / ۲۰۱۲ء، یہ مطبوعہ مطبع منشی نول کشور، لکھنو، جمادی الاولی ۱۳۱۲ھ مطابق نومبر ۱۸۹۴ء پر مبنی ہے۔ مرتب کا کہنا ہے: "تا امروز حدّ اقل در ایران متن منقح چاچی [کذا: چاپی] از آن سراغ نداریم... لذا نشر مجدد آن محسوس بود" (ص ۱۱) چونکہ آج تک کم از کم ایران میں اس متن کی تنقیح شدہ طباعت عمل میں نہیں آئی تھی لہذا اس کی تجدید اشاعت کی ضرورت تھی۔ ایرانی اشاعت ہندوستانی اشاعت کا محض چربہ اور ٹائپ کی صورت ہے کیونکہ مرتب نے نہ تو تعلیقات لکھی ہیں نہ

اشاریے بنائے ہیں۔ وہ محمد ایوب قادری کے مرتبہ و مترجمہ تذکرۂ علمائے ہند سے بھی بے خبر ہیں جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے پہلی بار ۱۹۶۱ء اور دوسری بار ۲۰۰۳ء میں شائع کیا تھا۔ مرتب کی طرف سے مختصر دیباچہ اور آخر میں فہرست تراجم دی ہے۔ ٹائپ کی کئی اغلاط نظر آئی ہیں۔ ممبر کونسل کو ممرّ کونسل، جوبلی کو جیوبلی (ص ۳۲۲)، مجبی کو مجھی، رمضان مہمی کو رمضان مھیمی اور قصبہ مہم کو مھیم (ص ۳۲۴) لکھا ہے۔ مرتب نے سرورق پر مصنف کی مکانی نسبت احمد آبادی جلی قلم سے لکھی ہے جو اگرچہ درست ہے کیونکہ مصنف نارہ مشہور بہ احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے لیکن یہ گجرات کا معروف احمد آباد نہیں بلکہ ضلع الہ آباد کا قصبہ ہے۔

تذکرہ علمائے ہند و پاکستان، سید سعید اختر رضوی

تذکرہ علمای ہند و پاکستان**، سید سعید اختر رضوی، ترجمہ و اضافات ذوالفقار علی، ناشر: منشور سمیر، تہران، ۱۳۹۷ش / ۲۰۱۸ء، برصغیر کے شیعہ علما کے تذکرے پر مشتمل ہندوستانی مصنف (۱۹۲۷-۲۰۰۲) کی اردو کتاب خورشید خاور کا فارسی ترجمہ مع اضافات ہے۔ اس میں الفبائی ترتیب سے ۳۷۶ علما کا ذکر ہوا ہے۔

خورشید خاور، دیکھیے: تذکرہ علمای ہند و پاکستان

شیعہ در ہند، سید اطہر عباس رضوی

یہ مصنف (۱۹۲۱-۱۹۹۴ء) کی دو جلدوں میں انگریزی کتاب *A Socio-intellectual history of the Isna 'Asharishi'is in India* (مطبوعہ ۱۹۸۶ء) کا فارسی ترجمہ ہے۔

شیعہ در ہند**، ناشر: دفتر تبلیغات اسلامی حوزہ علمیہ، قم، ۱۳۷۶ش، یہ صرف پہلی جلد کا ترجمہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر بطور مترجم "دفتر تبلیغات اسلامی حوزہ علمیہ قم، مرکز مطالعات و تحقیقات اسلامی- واحد ترجمہ" درج ہے۔ اس ترجمے کی اغلاط اور نواقص پر منصور معتمدی نے جب مقالہ لکھا[۳] تو مترجمین اور ناشر نے دوسری جلد کا ترجمہ روک دیا اور شائع نہیں کیا۔ بعد میں خود منصور معتمدی نے دونوں جلدوں کا ترجمہ کیا جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔

---

[۳]۔ دیکھیے ماہنامہ آینہ پژوہش، قم، شمارہ ۴۷، سال ۱۳۷۶ش، ص ۲۲-۲۸

مطلع انوار، سید مرتضی حسین صدرالافاضل

مطلع انوار (احوال دانشوران شیعۂ پاکستان و ہند)**، سید مرتضی حسین صدرالافاضل، ترجمۂ محمد ہاشم، ناشر: بنیاد پژوہش ہای اسلامی آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۷۴ش / ۱۹۹۵ء، یہ پاکستانی مصنف (۱۳۴۱-۱۴۰۷ھ) کی اسی نام سے اردو کتاب کا فارسی ترجمہ ہے جس میں برصغیر کے طبقات شیعہ کا ذکر ہوا ہے۔ مترجم نے مصنف کے حواشی اور وزن سے خارج عربی فارسی اشعار کو حذف کردیا ہے:
''در ترجمۂ آن نیز سعی شدہ است کہ از حواشی و شروح زاید و مفصل و ملال آور خودداری شود۔ بعضی از اشعار عربی و فارسی مندرج در کتاب کہ بہ نظر ناموزون رسیدہ تا حد امکان حذف یا اصلاح شدہ۔'' (ص۶)

نجوم السماء فی تراجم العلماء، میرزا محمد علی آزاد بن صادق علی کشمیری لکھنوی

کتاب نجوم السماء فی تراجم العلماء، ناشر: مکتبہ بصیرتی، قم، ۱۳۵۲ش / ۱۹۷۴ء، یہ گیارہویں تا تیرہویں صدی ہجری میں شیعہ علما کا تذکرہ ہے جس کی تصنیف ۱۲۸۶ھ میں شروع ہوئی اور مصنف کی وفات (۱۳۰۹ھ) تک جاری رہی۔ یہ مطبع جعفری لکھنو ۱۳۰۳ھ سے چھپا تھا، ایرانی اشاعت اسی کا عکس ہے۔ ابتدا میں آیت اللہ سید شہاب الدین مرعشی کا ایک رسالہ بطور حالات مصنف ''نبراس النور و الضیاء فی ترجمۃ مؤلف نجوم السماء'' درج ہے۔
مکتبہ بصیرتی، قم ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۵، ۲ جلدیں، ایک جلد متن، دوسری جلد آیت اللہ شہاب الدین حسینی مرعشی نجفی کا اس کتاب پر تکملہ ہے۔
نجوم السماء فی تراجم العلماء (شرح حال علمای شیعہ قرن ہای یازدہم و دوازدہم و سیزدہم ہجری قمری)*، تالیف محمد علی آزاد کشمیری، بہ تصحیح میر ہاشم محدّث، ناشر: شرکت چاپ و نشر بین الملل وابستہ بہ موسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران ۱۳۸۲ش / ۲۰۰۳ء۔ یہ اشاعت مطبع جعفری، لکھنو ۱۳۰۳ھ پر مبنی ہے۔ مرتب نے حواشی اور اشاریوں کا اہتمام کیا ہے اور مقدمہ لکھا ہے۔

ورثۃ الانبیا، سید احمد نقوی لکھنوی معروف بہ علامہ ہندی

ورثۃ الانبیا، سید احمد نقوی لکھنوی، بہ ہمراہ بخشی از تذکرۃ العلماء المحققین فی آثار الفقھا والمحدثین سید مہدی بن نجف علی حسینی رضوی عظیم آبادی، تصحیح علی فاضلی، ناشر: موسسہ کتاب شناسی شیعہ، قم،

۱۳۸۹ش / ۲۰۱۰ء۔ ہندوستان میں سید دلدار علی لکھنوی کے خاندان کے شیعہ علما کا تذکرہ ہے۔

ہندی علما کے تصنیف شدہ شیعہ علما کے کچھ عربی تذکرے بھی ایران اور عراق سے شائع ہوئے ہیں جو اگرچہ ہمارا موضوع نہیں ہے لیکن ان کا ذکر فائدے سے خالی نہیں ہے۔ جیسے اعجاز حسین کنتوری لکھنوی کی شذور العقیان فی تراجم الاعیان مطبوعہ قم؛ سید علی نقی نقوی کی تراجم مشاہیر علماء الھند مطبوعہ کربلا (عراق)، ۲۰۱۴ء؛ مفتی محمد عباس شوشتری کی اوراق الذھب مطبوعہ قم، ۱۳۹۴ ش / ۲۰۱۵ء۔

ایران میں ایسے تذکرے بھی شائع ہوئے ہیں جو اہل ایران نے ایران میں بیٹھ کر بالخصوص بر صغیر کے شعرا کے بارے میں تصنیف کیے۔ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ مثال کے طور پر: شیعیان شکرستان ہند (تذکرہ شعرا و ادبای شیعی در شبہ قارہ ہند) تالیف و تدوین یوسف بیگ باباپور، باہمکاری مجید صاریان و مرواریدر فوگران و پریسا سنجابی، ناشر: منشور سمیر، تہران، ۱۳۹۴ش / ۲۰۱۵ء، یہ الفبائی ترتیب سے انسائیکلوپیڈیا طرز پر تدوین ہوا ہے۔ کتاب کے پہلے سو صفحات بر صغیر کی سیاسی، سماجی، علمی، روحانی تاریخ پر ہیں۔

اطبا کے تذکرے

قانون ابن سینا، شارحان و مترجمان آن، حکیم سیّد ظلّ الرحمان

قانون ابن سینا، شارحان و مترجمان آن*، تالیف حکیم سید ظل الرحمان، ترجمہ سید عبدالقادر ہاشمی، ناشر: انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ۱۳۸۳ش / ۲۰۰۴ء، یہ مصنف کی اردو تصنیف ''قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین'' کا فارسی ترجمہ ہے۔ مترجم کتاب اصلاً ہندی ہیں لیکن ایران میں رہتے تھے۔ کتاب پر مصنف اور مترجم کے مقدموں کے علاوہ ایرانی عالم ڈاکٹر مہدی محقق کا ابن سینا اور اس کی القانون فی الطب کے بارے میں عالمانہ مقدمہ ہے۔ ابن سینا کی القانون کے شارحین اور مترجمین کا تذکرہ ہے۔ کتاب بغیر اشاریے کے ہے۔

خوشنویسوں کے تذکرے

تحفۃ المحبّین، یعقوب بن حسن بن شیخ الملقب بسراج الحسنی الشیرازی

تحفۃ المحبّین* تصنیف یعقوب بن حسن سراج شیرازی، بہ اشراف محمد تقی دانش پژوہ، بہ کوشش

کرامت رعنا حسینی وایرج افشار، ناشر: نشر نقطہ، تہران، ۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء؛ اصول خطاطی اور خوش نویسی کے کچھ روحانی پہلوؤں پر نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کا ایرانی مصنف ہندوستان آیا تھا اور یہ کتاب ۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء میں محمد آباد، بیدر میں تصنیف ہوئی۔ یہ اشاعت فرانس کے قومی کتب خانہ، پیرس کے قلمی نسخے پر مبنی ہے۔ آخر میں کئی اشاریے ہیں۔

تذکرہ خوشنویسان، غلام محمد ہفت قلمی دہلوی

تذکرہ خوشنویسان*، غلام محمد ہفت قلمی دہلوی، بسعی واہتمام و تصحیح محمد ہدایت حسین، ناشر: روزنہ، تہران، ۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء، یہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کلکتہ، ۱۹۱۰ء اشاعت کا ہو بہو عکس ہے۔ حمید رضا قلیچ خانی نے بھی مطبوعہ کلکتہ اور برٹش لائبریری کے ایک مخطوطے کی بنیاد پر اس کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے جو ابھی طبع نہیں ہوا۔ قلیچ خانی نے جہانگیر اور شاہ جہان عہد کے نامور خطاط محمد حسین کشمیری کا تذکرہ بھی تصنیف اور شائع کیا ہے (تہران، ۱۳۹۲ش)۔

حیات خوشنویسان، محمد حسین بن حسن بن سعید علوی شیرین رقم

تذکرۂ حیات خوشنویسان از محمد حسین علوی بہ پیوست احوال خطاطان از محمد بختاور خان*، تصحیح و توضیح حمید رضا قلیچ خانی، ناشر: کتابخانہ، موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، تہران، ۱۳۹۲ش/۲۰۱۳ء، یہ خوشنویسوں کا عمومی منظوم تذکرہ ہے جو ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں تصنیف ہوا۔ اس اشاعت کی بنیاد سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کا قلمی نسخہ شمارہ ۱۴۳۴ مکتوبہ ۱۳۰۵ھ ہے۔ دوسرے حصے میں بختاور خان کی تصنیف مرآت العالم سے خوشنویسوں کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔ مرآت العالم کی یہ تلخیص مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء اور مخطوطہ سالار جنگ میوزیم شمارہ ۶۰۰/۳ پر مبنی ہے۔ آخر میں خطاطی کے نمونے اور اشاریے ہیں۔

مقدمات عبدالحق میں ذکر شبلی کا مطالعہ و تجزیہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

azmi408@gmail.com

مولوی عبدالحق (۱۸۷۰-۱۹۶۱ء) نے اردو زبان و ادب کی مدۃ العمر ایسی لازوال خدمت انجام دی کہ قوم نے انھیں 'بابائے اردو' کے خطاب سے نوازا۔ اور اب وہ اسی نام سے ہر زبان پر ہیں اور شاید جب تک اردو زندہ رہے گی ان کی عظمت کا ذکر اسی طرح ہوتا رہے گا۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد تھے۔ ایم اے او کالج علی گڑھ میں ان سے پڑھا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مورخ تھے۔ ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہو جایا کرتا تھا۔ وہ موقع بہ موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ اس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔........ جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔ علی گڑھ میں آکر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے فارسی لی۔ اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے استاد ملے۔[1]

یہ اقتباس ان کے مضمون مطبوعہ ماہنامہ انشا کراچی اکتوبر ۱۹۵۹ء کا ہے۔ یعنی ان کی زندگی کے آخری دور کا ہے۔ لیکن اس سے پہلے انھوں نے کبھی یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ علامہ شبلی کے شاگرد ہیں اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے، بلکہ ان کی حیثیت ہمیشہ ایک مخالف کی رہی۔ حیات شبلی ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی۔ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کر لیا تھا کہ جا و بے جا ان پر اعتراض کریں مگر کبھی انھوں نے اس کے سوا کہ "یہ الزام صحیح نہیں" ان سے کچھ نہیں کہا۔[2]

سید صاحب کے اس خیال میں بڑی صداقت ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا ایک بڑا ادبی کارنامہ قدیم

---

[1] ماہنامہ ادیب، شبلی نمبر، علی گڑھ، ۱۹۶۰، ص: ۱۴-۱۵

[2] سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۵ء، ص: ۶۹۱

کتابوں پر انتہائی محنت و تحقیق سے مقدمہ لکھنا بھی ہے۔ بلکہ ایک زمانہ میں وہ اس کام کے لیے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ اس حوالے سے انھوں نے اردو کی جو خدمت انجام دی ہے اب وہ تاریخ ادب اردو کا ایک اہم باب ہے، مگر انھوں نے کئی مقدمات میں علامہ شبلی کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ یا تو محض نقد کیا ہے۔ یا ان کی حق تلفی کی ہے، حتیٰ کہ تنقیص بھی کی ہے۔ غالباً ہجرت تک ان کا یہی معاملہ رہا۔ خاص طور پر ان کے مقدمات میں تو ان کا یہی رویہ پایا جاتا ہے۔ ''مقدمات عبدالحق'' ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔ اس کے پانچ مقدمات میں علامہ شبلی کا ذکر بانداز تنقید و تنقیص موجود ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مقدمہ تذکرہ گلشن ہند۔ ۱۹۰۶ء

۲۔ مقدمہ حیات النذیر۔ ۱۹۱۲ء

۳۔ مقدمہ مثنوی خواب و خیال۔ ۱۹۲۶ء

۴۔ مقدمہ تمدن ہند

۵۔ مقدمہ خطوط شبلی۔ ۱۹۲۶ء

۱۔ تذکرہ گلشن ہند:

۱۹۰۱ء میں حیدرآباد (رود موسی) میں زبردست سیلاب آیا اور اس نے بڑی تباہی مچائی۔ اس وقت علامہ شبلی وہیں حیدرآباد میں تھے۔ یہ سیلاب کسی اہل علم کا کتب خانہ بھی بہا لایا۔ اس میں جو کتابیں برآمد ہوئیں، ان میں تذکرہ گلشن ہند کا مخطوطہ بھی تھا جو مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ دولت آصفیہ کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ انھوں نے اسے علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں پیش کیا جو اس وقت سررشتہ علوم وفنون کے ناظم اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر مولوی غلام محمد صاحب کی خواہش تھی کہ اسے ایڈٹ کرکے انجمن کی جانب سے شائع کیا جائے، مگر بقول عبداللہ خاں ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ ''انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے نہ چھاپ سکی''۔[۳]

اس کے بعد علامہ شبلی سررشتہ علوم وفنون کی نظامت اور انجمن ترقی اردو سے مستعفی ہوگئے، تاہم گلشن ہند کی طباعت واشاعت کا خیال ان کے دل سے نہ گیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کی تصحیح و مراجعت

---

[۳] مرزا علی لطف۔ التماس، گلشن ہند، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، ۱۹۰۶، ص: ۲۔

کی۔ حواشی اور وضاحتی و تشریحی نوٹ لکھے۔ بعض اضافے کئے۔ املا کی تصحیح کی[۴] اور اسے عبداللہ خاں کے حوالہ کیا اور ان سے طباعت و اشاعت کی خواہش ظاہر کی۔[۵]

گلشن ہند کی تدوین کی یہ کوشش نہ صرف علامہ شبلی کی بلکہ اردو میں متنی تحقیق کی پہلی کوشش تھی اور اس کے آغاز کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے۔ اس کوشش کا اگر ذکر و اعتراف کیا گیا ہوتا تو اردو میں متنی تحقیق و تنقید کا بنیاد گذار علامہ شبلی کو قرار دیا جاتا۔ مگر مولوی عبدالحق نے اسے مٹا کر اپنے استاد علامہ شبلی سے یہ تاج فضیلت چھین لیا۔ ہوا یوں کہ جب علامہ شبلی نعمانی حیدرآباد سے لکھنؤ آگئے تو عبداللہ خاں نے اس کا ذکر مولوی عبدالحق سے کیا۔ چنانچہ انھوں نے علامہ شبلی کے مقدمہ کو ہٹا کر اپنا مفصل مقدمہ شامل کر دیا۔ جس میں علامہ شبلی کی کاوشوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہی نہیں اس میں علامہ شبلی نے جو حواشی لکھے تھے، ان کی بھی نشاندہی نہیں کی بلکہ اس کے برعکس ان پر سخت تنقیدیں کیں[۶]۔ تذکرہ گلشن ہند کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے طبع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مع گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

تذکرہ گلشن ہند میں خواجہ میر اثرؔ (م: ۱۷۹۵ء) کے تذکرے میں مرزا علی لطف نے ان کی مثنوی خواب و خیال کا ذکر کیا ہے اور بطور نمونہ چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ علامہ شبلی نے مثنوی خواب و خیال کے بارے میں مولانا حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) کے موقف پر نقد کیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ (مقدمہ شعر و شاعری) میں لکھنؤ کی شاعری پر صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ بن سکتی ہے؟[۷]

علامہ شبلی کے موقف کی تردید میں بابائے اردو کی تنقید ملاحظہ ہو:

---

[۴] معارف اکتوبر، ۱۹۲۰ء، ص: ۲۶۲

[۵] حوالہ سابق

[۶] تفصیل کے لئے راقم کا مقالہ گلشن ہند مشمولہ ''آثار شبلی''، مطبوعہ دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۳ء، ص: ۳۷۱-۳۸۹ دیکھا جا سکتا ہے۔

[۷] مرزا علی لطف۔ حوالہ سابق، ص: ۳۲۔

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف اعتراف کا لفظ لکھا حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کی جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی ہے۔ عام شاعری پر یا اردو شاعری کے نشو و نما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آ گیا ہے اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں، تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو میں فن تنقید پر پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے وہ صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں تو لوگوں کو ان کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہونچا اور وہ بت جنھیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے یکایک متزلزل ہو گئے اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ در حقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا۔ صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس کی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔[۸]

اس طویل اقتباس میں اصل بحث کے سوا کئی امور قابل غور ہیں۔ مثلاً وہ علامہ شبلی کو ہر جگہ مولوی اور مولانا حالی کو ہر جگہ مولانا لکھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ مولانا کون تھا۔ یہی نہیں علامہ شبلی کی تنقید کی وجہ سے وہ ان کے علم و فضل پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کے مذاق سلیم پر پہلے شبہ کرتے ہیں، پھر اسے عامیانہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ پورا اقتباس علامہ شبلی کی ہجو ملیح ہے۔ حالانکہ معاملہ

---

[۸] مرزا علی لطف۔ مقدمہ گلشن ہند، ص: ۱۹-۲۰

صرف اتنا ہے کہ مولانا حالی نے بغیر نام لئے دبستان لکھنؤ پر سخت چوٹیں کی تھیں۔ گو انھوں نے دبستانوں کی تخصیص نہیں کی ہے، مگر سب جانتے ہیں ان کی زد پر لکھنوی مذاق شعر و ادب ہی تھا۔ اس کے خلاف تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چکبست نے تو متعدد مقامات پر مولانا حالی کے جوابات لکھے ہیں اور ان پر تنقیدیں کی ہیں۔

جہاں تک مثنوی خواب وخیال کے متعلق علامہ شبلی کے نقطۂ نظر کا معاملہ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ مثنوی خواب وخیال کے بعض اشعار سے اگرچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب مرزا شوق نے اس سے استفادہ کیا ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ تذکرۂ گلشن ہند میں اس کے جو اشعار درج ہیں ان سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ مرزا شوق کی مثنوی اس سے مستفاد ہے۔ اس سے علامہ شبلی کے موقف کی بھی تائید ہوتی ہے۔

اسی طرح بابائے اردو کے اس خیال سے کہ مولانا حالی نے میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ انیس و دبیر میں اتنا نہیں سراہا، کس قدر خلاف واقعہ بات ہے۔ ان کا ادعا دیکھئے کہ فرماتے ہیں کہ مثنوی گلزار نسیم کا اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں!

چکبست نے گلزار نسیم کا دیباچہ لکھا تو بعض مسائل میں ان کے کسی دوست نے علامہ شبلی سے خط وکتابت کی۔ چکبست نے اپنے مقدمے میں جہاں مولانا حالی کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں اس کے حاشیے میں علامہ شبلی کے خط کا ایک سطری اقتباس نقل کیا ہے کہ ''گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے''۔[۹]

''گلشن ہند'' کے اسی مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے اس پر بھی نقد ضروری خیال کیا ہے اور چراغ پا ہو کر لکھا ہے:

> افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ

---

[۹] دیباچہ گلزار نسیم، بحوالہ مضامین چکبست، انڈین پریس، الہ آباد، ۱۹۳۷ء، ص: ۱۴۴۔

نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پر ہے۔"[۱۰]

نقادوں کے درمیان تضاد بیانی کی یہ پہلی مثال نہیں ہے۔ اس سے ہمارا ادبی ذخیرہ بھرا پڑا ہے۔ حالی و شبلی معاصر تھے، دونوں زندہ تھے اور دونوں کے درمیان خط و کتابت ہو رہی تھی، باوجودیکہ مولوی صاحب نے کس انداز سے علامہ شبلی کی تردید کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چاہے جس کا بھی موقف درست ہو، تحقیق و تنقید میں مولوی عبدالحق کا یہ اسلوب کسی نوع سے درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور خاص طور پر اپنے استاد کے لئے تو یہ رویہ سرے سے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اس مقدمے میں بابائے اردو سے کئی اصولی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کی نشاندہی اور تجزیہ یہاں ہمارا موضوع نہیں تاہم ایک دو کا ذکر ضروری ہے کہ ان کا تعلق بھی علامہ شبلی ہی سے ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تذکرۂ گلشن ہند کا مخطوطہ مولوی غلام محمد کے ہاتھ لگا تھا اور انھوں نے اسے ایڈٹ کر کے شائع کرنے کے لئے علامہ شبلی کے حوالے کیا تھا، لیکن بابائے اردو لکھتے ہیں:

یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر اور نایاب تذکرہ ہے۔ اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص (عبداللہ خاں) کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمائش کو جو انھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا۔"[۱۱]

اسے 'صرف نظر' نہیں بددیانتی کا نام دیا جانا چاہیے۔ بابائے اردو نے اصل کتاب میں ترمیم و تنسیخ کی، حالانکہ ان کو یہ اختیار نہ تھا۔ ایک متنی محقق کو تصحیح متن اور ضروری حواشی کے سوا کسی کے کلام کو خارج یا اضافہ کرنے کا حق نہیں ہوتا لیکن انھوں نے ایسا ہی کیا۔ عبداللہ خاں لکھتے ہیں:

اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے، البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونہ کلام جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا اس میں صرف عمدہ

---

[۱۰] حوالہ سابق، ص: ۲۱

[۱۱] ڈاکٹر عبادت بریلوی، مقدمات عبدالحق، کوہ نور پریس، دہلی، ۱۹۷۳، ص: ۶۱

نمونہ چن لیا گیا ہے اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا۔[۱۲]

اب بابائے اردو کا بیان سنئے:

مؤلف نے شعراء کا کلام جو بطور انتخاب درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلی درجہ کے اشعار رکھے ہیں۔ خود مؤلف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دیئے تھے اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا۔[۱۳]

مقدمہ نگار اور پبلشر کے اقتباسات سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ پبلشر کی التماس بابائے اردو کی نظر سے نہیں گذری۔ ورنہ یہ تضاد اس میں پیدا نہ ہوتا۔ دوسرے یہ کہ تذکرۂ گلشن ہند کی تصحیح وتدوین اور تحقیق متن کا کام اب بھی باقی ہے اور ضروری ہے کہ اصل تذکرے کو محقق انداز میں شائع کیا جائے اور دکھایا جائے کہ مولوی عبدالحق کے تصرفات بیجا سے شعرا کا کون کون سا کلام سامنے نہ آسکا۔

عبداللہ خاں کے دو صفحے کے التماس نے علامہ شبلی کے اس کام کو روشنی میں لا دیا، ورنہ علامہ شبلی کی اس ادبی کاوش سے زمانہ کبھی واقف نہ ہوتا۔

بابائے اردو نے دیانت کے خلاف ایک اور کام کیا ہے۔ اصل تذکرے میں شاہ ولی اللہ اشتیاق کی بعض کتابوں کے نام غلط درج تھے۔ مولانا شبلی نے حاشیے میں اسے غلط بتایا ہے۔ دراصل مرزا علی لطف نے شاہ ولی اللہ اشتیاق کو شاہ ولی اللہ دہلوی تصور کر لیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی بعض کتابوں کے نام لکھے تھے۔ علامہ شبلی نے ان کتابوں کو فرضی قرار دیا ہے۔ دراصل انھوں نے بھی شاہ ولی اللہ اشتیاق کو شاہ ولی اللہ دہلوی ہی سمجھا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ بابائے اردو نے علامہ شبلی کے فٹ نوٹ کو اپنے مقدمے میں اپنی تحقیق بتا کر پیش کر دیا ہے۔[۱۴]

---

[۱۲] التماس، ص: ۱۲

[۱۳] مقدمہ، گلشن ہند، ص: ۲۴

[۱۴] مقدمات عبدالحق، ص: ۸۷

۲۔ مقدمہ حیات النذیر

ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح عمری ''حیات النذیر'' سید افتخار عالم مارہروی (م: جولائی ۱۹۲۴ء) نے لکھی ہے۔ اس کا مقدمہ بھی مولوی عبدالحق کے قلم سے ہے۔ اس مقدمے میں بھی مولوی صاحب نے اپنے استاد علامہ شبلی پر انتہائی سخت اور نازیبا تنقیدیں کی ہیں۔ مقدمہ کی تمہید ہی میں بغیر نام لئے علامہ شبلی پر سخت چوٹ کی ہے اور ان کی سوانح نگاری کو ''لایعنی'' اور انہیں ''بدبیں'' وغیرہ کے الفاظ سے نوازا ہے۔ انہوں نے تمہید میں سوانح نگاری کے جن اصولوں پر بحث کی ہے، اگر انہیں تسلیم کرلیا جائے تو ہمارا ذخیرۂ سوانح عمری خرافات کا مجموعہ ثابت ہو جائے گا۔

دوسری خرابی اس مقدمے کی یہ ہے اس میں مولوی عبدالحق نے ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی کے تعلقات پر حرف زنی کی ہے حالانکہ ان بزرگوں کے تعلقات ہمیشہ اچھے اور استوار رہے۔ اور یہ تعلقات اس وقت سے قائم تھے جب مولوی صاحب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت ڈپٹی نذیر احمد اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔

تیسری بات صریح کذب بیانی کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب ''امہات الامہ'' اپنے بعض مشمولات کے سبب علماء کے درمیان ناپسندیدہ قرار پائی اور ندوۃ العلما ایک جلسہ میں مشورے سے، جس میں خود مصنف ڈپٹی نذیر احمد کا مشورہ بھی شامل تھا، وہ نذر آتش کردی گئی۔ بابائے اردو کو یہ واقعہ سخت ناگوار گذرا۔ چنانچہ انہوں نے ''حیات النذیر'' کے مقدمے میں اس عمل کے خلاف سخت ناگواری کا اظہار کیا ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ جو لوگ ''امہات الامہ'' کے جلانے میں پیش پیش رہے، ان سے مولوی عبدالحق کے تاحیات اچھے مراسم و تعلقات قائم رہے اور جو شخص اس واقعے میں شریک نہ تھا، وہی واقعے کا اصل ذمے دار قرار پایا۔ انہوں نے اس کا مورد الزام علامہ شبلی کو ٹھہرا کر ان کی طرح طرح سے تنقیص و تذلیل کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> طالب علمی کے زمانے میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کردیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر محکم دلائل اور پرزور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہوگئی۔ اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ محض افسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے، مگر جب مجھے اس واقعے کی خبر لگی اور خصوصاً جب میں نے یہ سنا کہ علامہ

موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کار خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا۔ اور اب تک میرا خیال ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ جلادیا ہو۔[۱۵]

پورے مقدمے میں کسی بھی شریک واقعہ شخص کا نام سوائے علامہ شبلی کے انہوں نے نہیں لیا ہے۔ دراصل کوشش یہ کی ہے کہ تمام تر تذلیل علامہ کی ہو۔ اور صرف علامہ ہی کی نہیں جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے ان کی تحقیقات پر بھی حملہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی اس واقعے میں سرے سے شامل ہی نہیں تھے۔ حیات شبلی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

اس واقعے کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقی اردو نے اپنے مقدمہ حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف بواسطہ یا بلاواسطہ بے وجہ اور بلا تحقیق منسوب کرکے ایک تاریخی جرم کیا ہے۔ حالانکہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود نہ تھے۔ مولانا شروانی صاحب نے، جو شریک جلسہ تھے، مقدمہ مقدمات عبدالحق (ص ۸) میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھ دی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد واقعات کی نسبت میں کتنی بے احتیاطی برتتے ہیں۔[۱۶]

اس کذب بیانی اور تنقیص شبلی کے کارنامے سے بابائے اردو کی حقیقت نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس تحریر کے بعد تقریباً پچاس برس مولوی عبدالحق صاحب زندہ رہے، مگر انہیں اپنے غلط موقف کی تردید یا تصحیح کا خیال نہ آیا۔

۳۔ مقدمہ مثنوی خواب وخیال

تذکرۂ گلشن ہند میں میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' پر حالی و شبلی کی متضاد آرا اور اس پر مولوی عبدالحق کے تند و تیز تبصرے کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں بابائے اردو نے اسے مرتب کرکے شائع کیا۔ اس پر بھی انھوں نے حسب عادت طویل مقدمہ لکھا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ وہ جس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہیں کتاب اور صاحب کتاب کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض مقدمے طوالت کے لحاظ سے کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا اسلوب نگارش یا دوسرے لفظوں میں ان کی نثر طول بیانی کا بھی نمونہ ہے۔ وہ اس میں بعض غیر ضروری باتیں بھی لکھ

---

[۱۵] افتخار عالم مارہروی۔ حیات النذیر، شمسی پریس دہلی۔ ۱۹۱۲ء، ص: ۷۔

[۱۶] حیات شبلی، ص: ۴۷۸

جاتے ہیں۔

بابائے اردو نے علامہ شبلی کے متعلق تذکرۂ گلشن ہند کی بحث کو مثنوی خواب وخیال کے دیباچے میں بھی دہرایا ہے اور تقریباً اسی انداز سے خامہ فرسائی کی ہے۔[۱۷]

۴۔ مقدمہ تمدن ہند:

''تمدن عرب'' کے مصنف موسیو گوستاولیبان کی دوسری تصنیف ''تمدن ہند'' ہے۔ مولوی سید علی بلگرامی (۱۸۵۱-۱۹۱۱ء) نے اسے اردو جامہ پہنایا ہے۔ اس پر بھی مولوی عبدالحق کے قلم سے مقدمہ ہے۔ اصل کتاب اور ترجمے کے ذکر سے پہلے بابائے اردو نے مترجم کے مفصل حالات وسوانح قلم بند کئے ہیں جس میں ولادت سے وفات تک کے تمام احوال لکھے ہیں۔ مولوی سید علی بلگرامی دولت آصفیہ میں بڑے عہدہ پر فائز تھے اور زندگی کا بیشتر حصہ حیدرآباد میں گذارا۔ مقدمہ نگار کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے، اس لئے ان کے ذاتی اور نجی حالات اور دیکھے اور برتے ہوئے واقعات بھی لکھے ہیں۔

مولوی سید علی بلگرامی گو عمر وعہدے میں علامہ شبلی سے بڑے تھے، مگر دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ پہلی بار جب سر سید کے ساتھ علامہ شبلی حیدرآباد گئے تھے تب سے مراسم قائم تھے۔ ''الفاروق'' کے دیباچے میں ان کا بڑا والہانہ ذکر ہے۔ علامہ شبلی جب ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد گئے تو ان کے تعلقات میں اور گہرائی اور موانست پیدا ہوگئی۔ ابتدا میں علامہ شبلی کا قیام ان کے مکان پر ہی رہا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جدید علوم کی کتابوں اور قدیم اسلامی ذخائر کا معدن تھا۔ ایک وجہ تعلقات یہ بھی تھی۔ اور وہ ان کی مجلس کے حاضر باشوں میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے متعدد جگہ ان کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سوائے ایک دو جگہ کے ہر جگہ علامہ شبلی کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ یہاں انھیں نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ حیدرآباد میں علامہ شبلی کے تقرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مرحوم (مولوی سید علی بلگرامی) نے نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں، جو بڑے قدرداں امیر تھے، ایک سررشتہ علوم وفنون قائم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ

---

[۱۷] مقدمات عبدالحق، ص: ۲۳۲

تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہونچایا جائے۔ مرحوم اس سر رشتے کے نگراں مقرر ہوئے اور ان کی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لئے کوئی مناسب شخص انھیں نہ ملا تھا، لہذا انھوں نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم سر رشتہ علوم و فنون پر بہ مشاہرہ... ہوا۔ در حقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اس سلسلے میں شائع ہوئی تھیں، لیکن ملک کی بد نصیبی سے یہ سر رشتہ ٹوٹ گیا۔[۱۸]

بابائے اردو نے مولانا شبلی کے انتخاب کو بہت اچھا بتایا ہے لیکن اس طرح کہ کوئی مناسب آدمی نہیں ملا تھا، اس لئے مولانا شبلی کا انتخاب ہوا۔ لیکن یہ واقعہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۱ء میں جب علامہ شبلی حیدر آباد پہنچے تو ناظم سر رشتہ علوم و فنون کے عہدہ پر مولوی مرتضیٰ صاحب فائز تھے۔ مولوی عزیز مرزا (۱۸۶۵ء۔ ۱۹۱۲ء) نے ان کا تبادلہ شعبۂ مالیات میں کرایا اور ان کی جگہ پر علامہ شبلی کا تقرر عمل میں آیا۔

۲۔ مولوی سید علی بلگرامی کی مروت اور اہل علم کی قدر دانی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مجلس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مرحوم بہت بامروت تھے۔ اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اس کو پوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اسی شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد برآری میں کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ کتابیں جو انھیں بہت عزیز تھیں ان کے دینے میں بھی تامل نہ تھا، بشر طیکہ وہ سچا قدرداں ہو خاص کر طالب علموں اور اہل علم کا بہت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم اور مولوی ظفر علی خاں مرحوم کے یہاں مدعو تھے۔ بارہ بجے کھانے کے بعد چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے رہے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ مرحوم نے ان کی درخواست پر فوراً ''کامل مبرد'' کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ، جس کی قیمت ستر روپے ہے، مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم جو کتابوں کا شوقین ہے اہل علم کی درخواست رد نہیں کر سکتا۔[۱۹]

---

[۱۸] مقدمات عبدالحق، ص: ۳۸۶

[۱۹] مقدمات عبدالحق، ص: ۳۹۳۔۳۹۴

اب دیکھئے، مولوی سید علی بلگرامی نے خوش ہو کر کتاب نذر کی ہے، مگر مولوی عبدالحق نے اسے درخواست بنادیا۔

۳۔ اسی سلسلے یعنی کتاب نذر کرنے کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو:

مرحوم (مولوی سید علی بلگرامی) نے ردالمنطقیین لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کرواکر مولوی شبلی کی نذر کی۔ انگلستان پہنچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے، آپ وہ نسخہ بھجوادیجئے۔ مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی ہے اس لئے آپ طلب کرتے ہیں۔ مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا جواب یہ دیا کہ پانچ سو روپئے کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوادیں۔ چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصاب تعلیم کے مرتب کرنے کے لئے حیدرآباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے بارے میں ملے نہیں لیکن کتب خانے کے جلسۂ انتظامی میں اتفاق سے جب مٹھ بھیڑ ہوگئی تو مرحوم اس خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا۔[20]

اس بے سروپا قصے میں انھوں نے علامہ شبلی کی عادت ''سخت بگڑنے والی'' بتائی ہے۔ ایک طرح سے محسن کش بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مولانا شبلی نے سرے سے اس طرح کے کسی واقعہ کے ہونے کی تردید کی، تب بھی اس عبارت کو مقدمہ سے خارج نہیں کیا بلکہ ہو بہو باقی رکھا اور جب 'چند ہم عصر' شائع کی تو اس طویل افسانہ کے جواب میں حاشیہ میں محض ایک سطری نوٹ لکھ کر خاموش ہوگئے۔[21]

۴۔ انھیں سے متعلق ایک اور واقعہ سنئے:

جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا تو وہ خواہ کہیں کا ہو ان کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ان کا مہمان ہو۔ چنانچہ مولانا شبلی جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے۔ مرحوم کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً پہنچے اور اپنے گھر لے

---

[20] مقدمات عبدالحق، ص: ۳۹۴

[21] مولوی عبدالحق۔ چند ہم عصر، انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ۱۹۹۹ء، ص: ۸۰۔

گئے، لیکن جب مولانا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اٹھ گئے تو مرحوم کو بہت رنج ہوا اور یہ رنج ان کے خطوط سے بھی مترشح ہوتا ہے۔[۲۲]

اس اقتباس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی چند روز مولوی سید علی بلگرامی کے یہاں رہے اور جونہی ملازمت ملی ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی، لیکن یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ مولانا شبلی ان کے یہاں نو ماہ رہ چکے تھے۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا رواداری نبھا سکتا ہے اور اس نو مہینہ رہنے کا انجام ملاحظہ ہو۔

۵۔ مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

جس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم ان کے یہاں مہمان تھے، ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ الٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی، مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گذار ہونا چاہئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔[۲۳]

یہ دراصل دونوں کے درمیان بے تکلفانہ باتیں تھیں، جن کو مولوی عبدالحق نے علامہ شبلی کی تحقیر کے لئے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔

ان تمام واقعات کے بعد اخیر دور میں ان کا یہ لکھنا کہ میں علامہ شبلی کا کبھی مخالف نہیں رہا، کس قدر مضحکہ خیز بات ہے۔[۲۴]

۶۔ شیعہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی

ایک دفعہ شمس العلماء مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو شیخ عبدالقادر جیلانی سے کیوں عداوت ہے، حالانکہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہوتی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر؟ فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادر کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتی ہے اگر یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے، اگر اسی طرح آپ کی آدھی

---

[۲۲] حوالہ سابق، ص: ۳۹۴-۳۹۵

[۲۳] حوالہ سابق، ص: ۴۰۶

[۲۴] ماہنامہ ادیب، شبلی نمبر، ص: ۱۵۔

سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔[۲۵]

''مقدمہ خطوط شبلی'' کے ذکر سے پہلے چند باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ ۱۹۲۶ء میں لکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے بابائے اردو نے کبھی مولانا شبلی مرحوم کے کسی کام کی تعریف و تحسین نہیں کی بلکہ ان میں کیڑے نکالتے رہے اور ان سرگرمیوں کی سرپرستی کرتے رہے جو علامہ شبلی کے خلاف ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں حافظ محمود شیرانی کا سلسلۂ تنقید شعرالعجم وہ خود رسالہ اردو میں، جس کے وہ ایڈیٹر تھے، شائع کر رہے تھے۔ اس کی ہر طرف دھوم تھی، حتی کہ اسی تنقید اور بعض دوسرے تنقیدی مضامین کی وجہ سے آج حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ انھوں نے تنقید شعرالعجم میں بڑی دقت نظری سے کام لیا، لیکن قارئین کے سامنے یہ نکتہ واضح نہیں کیا کہ علامہ شبلی نے جس وقت شعرالعجم لکھی تھی، ان کے سامنے اس کے بیشتر مآخذ مخطوطہ اور ناپید تھے اور شیرانی صاحب کے زمانے میں اس میں بیشتر طبع ہو کر عام ہو گئے تھے۔ بہر حال تنقید شعرالعجم کو دبستان شبلی میں اس لحاظ سے ناپسند کیا گیا کہ اس کی پشت پناہی بابائے اردو کر رہے تھے۔ اس میں وہ بڑی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ مثلاً ایک بار مولانا سید سلیمان ندوی نے ڈاکٹر سید عبداللہ سے کہا کہ وہ شیرانی صاحب سے کہہ دیں کہ وہ شوق سے تنقید لکھیں مگر مولوی عبدالحق کی پارٹی بن کر نہیں۔ چنانچہ انھوں نے سید صاحب کا یہ خیال شیرانی صاحب تک پہنچا دیا تو وہ برسوں ڈاکٹر سید عبداللہ سے ناراض رہے۔[۲۶]

مولانا سید سلیمان ندوی کی حیثیت اُس عہد میں علمی، ادبی اور تاریخی ہر حیثیت سے بابائے اردو سے کسی طرح کم نہ تھی اور وہ اُس دور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے بڑے واقف کار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے ذریعے شیرانی صاحب کو اپنے خوف سے آگاہ کیا۔

جہاں تک علامہ شبلی مخالف سرگرمیوں کی مولوی عبدالحق کی سرپرستی کا معاملہ ہے، اس کے متعلق ایک اور واقعہ سنئے۔ مقتدیٰ خاں شروانی نے ایک طویل مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان ہے ''مولانا شبلی کا قیام علی گڑھ''۔ اس میں انھوں نے بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے علامہ شبلی کی شخصیت پر

---

[۲۵] حوالہ سابق، ص: ۴۰۰

[۲۶] ڈاکٹر خلیق انجم،۔ مولوی عبدالحق کی ادبی و لسانی خدمات، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۹۲ء، ج۱، ص: ۱۹۲۔۱۹۳

آنچ آتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے انھیں خط لکھ کر اس مقالے کی داد دی اور لکھا کہ "آپ نے کیا چھپی چوریاں پکڑی ہیں"۔[۲۷] بابائے اردو کے اس نازیبا رویے سے ان کی علامہ شبلی مخالف سرگرمیوں کا کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۵۔ مقدمہ خطوط شبلی

۱۹۲۲ء میں منشی محمد امین زبیری (۱۸۷۰-۱۹۵۸ء) کو عطیہ بیگم سے معلوم ہوا کہ علامہ شبلی نے ان کو اوران کی بہن کو جو خطوط لکھے تھے وہ محفوظ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے وہ خطوط ان سے حاصل کئے۔ نقل کیا اور بعض خطوط کو اپنے رسالہ ماہنامہ "ظل السلطان" بھوپال میں بالاقساط شائع کیا۔ان کی تحریر کے مطابق انھوں نے اسے مکاتیب شبلی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی میں شامل کرنے کی سید صاحب سے خواہش ظاہر کی ہے، مگر انھوں نے منع کر دیا۔ حالانکہ انھوں نے مکاتیب شبلی کے طبع دوم میں بہت سے خطوط کا اضافہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں محمد امین زبیری کے دو بیانات ملتے ہیں۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ اولاً انھوں نے ان خطوط کو علامہ شبلی کے ایک ارادت مند کے پاس بھیجا، یا ان سے شائع کرنے کے سلسلے میں رائے مانگی، مگر انھوں نے اسے شائع کرنے سے منع کر دیا۔[۲۸] اس سے ان کا ارادہ متزلزل ہو گیا، مگر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کا حوصلہ بڑھایا، یہاں تک کہ اشاعت پر مجبور کر دیا۔[۲۹]

مولوی عبدالحق کی اس قدر دلچسپی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی عدم التفاتی کے سبب انھوں نے مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کو نظر انداز کر کے بابائے اردو سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ یہی مقدمہ اوراس کے مشمولات ہمارا موضوع مطالعہ و جائزہ ہیں۔

راقم گذشتہ پچیس برس سے شبلیات کا مطالعہ کر رہا ہے اور بچپن سے مختلف موضوعات پر نہ جانے کتنی کتابوں کے دیباچے اور مقدمے پڑھے ہیں، لیکن میری مطالعاتی زندگی میں ایسی بدترین تحریر پڑھنے کو کبھی نہیں ملی۔ میں نے اسے پہلے بھی پڑھا ہے لیکن آج جب اس پر لکھنے بیٹھا اور اس نظر سے

---

[۲۷] بدر منیر الدین، رقعات عبدالحق، خزینہ علم وادب لاہور۔ ۲۰۰۴ء۔ ص: ۳۰۷۔
[۲۸] محمد امین زبیری، خطوط شبلی، ظل السلطان بھوپال، طبع اول، ۱۹۲۶، ص: ۳
[۲۹] حوالہ سابق

اسے پڑھا تو میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالی جسے قلم دے اس کا فرض ہے کہ وہ حق و انصاف سے کام لے۔ تخریب، بددیانتی، سیاق و سباق اور پس منظر، کون سا پہلو ہے، جس میں بابائے اردو نے خیانت سے کام نہ لیا ہو۔ واقعہ یہ ہے یہ مقدمہ نہ صرف علامہ شبلی کے خلاف لکھی جانے والی بلکہ اردو میں اپنی نوعیت کی بدترین تحریر ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے علامہ شبلی کی تعریف میں کبھی ایک حرف نہیں لکھا، لیکن خطوط شبلی کے مقدمہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

> آپ نے اپنی عنایت سے مولانا شبلی مرحوم کے جو خطوط مجھے بھیجے ہیں میں نے انھیں بڑے شوق سے پڑھا اور جب تک میں شروع سے اخیر تک سب نہ پڑھ چکا میں نے انھیں ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ چند روز بعد میں نے دوبارہ پھر پڑھا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا شوق اب بھی کم نہیں ہوا۔ بڑا ظلم ہوگا اگر یہ خط یونہی پڑے پڑے ردی میں مل جائیں اور تلف ہو جائیں اور دنیا اس نعمت سے محروم رہ جائے۔[30]

اس کے بعد انھوں نے خطوط کی اہمیت وافادیت بیان کی ہے۔ مرزا غالب کی خطوط نگاری اور ان کی حیثیت وافادیت پر زور قلم صرف کیا ہے۔ پھر ان خطوط کے قابل لحاظ پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے:

> میں مولانا شبلی کے ان خطوط کو... کئی لحاظ سے قابل قدر سمجھتا ہوں۔ ایک تو ان کا طرز بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، جو ان کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا، جس کی وجہ آگے چل کر بیان کروں گا۔ تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بو آتی ہے جو ان کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے۔[31]

اس اقتباس میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔ مثلاً اسلوب نگارش کے بارے میں بابائے اردو نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے کیا واقعی ایسا ہے؟ شبلیات کا ایک ادنی طالب علم بھی اس سے اتفاق نہیں کرے گا۔ اس سے پہلے الفاروق، شعر العجم اور خود سیرۃ النبی جیسی لازوال کتابیں شائع ہو چکی تھیں، جس میں

---

[30] خطوط شبلی، ص: ۱۴

[31] حوالہ سابق، ص: ۱۶-۱۷

علامہ شبلی کے اسلوب بیان کی تمام خصوصیات موجود ہیں اور جن کا اعتراف ماہرین فن نے کیا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہن میں شاید یہ بات رہی ہوگی کہ وہ شعر العجم کی شکل تو حافظ محمود شیرانی کے ذریعہ بگاڑ چکے ہیں، اب کوئی اس کی شاندار نثر کا نام نہیں لے گا۔

اسی طرح خیالات کا بھی معاملہ ہے۔ خواتین کے سلسلۂ تعلیم کے متعلق ان کے بعض خطبات اور کانفرنس کی تقاریر سب کے سامنے تھیں۔ ہاں علامہ شبلی نے عطیہ فیضی کی تعلیمی سطح اور آزادانہ روش پر قدغن لگانے اور بر بنائے تربیت چند باتیں خطوط میں لکھی ہیں۔ اس کے بعد وہ اصل وجہ جسے بیان کرنے کے لئے بابائے اردو نے مذکورہ باتیں لکھی ہیں وہ یہ ہے کہ ان خطوں سے خلوص اور محبت کی بو آتی ہے اور اسی کو ثابت کرنے کے لئے انھوں نے پورے مقدمے میں زور مارا ہے۔ مثلاً اگلے پیرا گراف میں وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے اس جملے پر کہ شعر العجم صحیفہ حسن و عشق ہے، واقعات کی کھتونی نہیں، تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ شعر العجم واقعات کی کھتونی بھی اور صحیفۂ حسن و عشق کی داستان بھی۔ لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا کہ جس داستان کا تصور ان کے ذہن میں تھا وہ شعر العجم میں نہیں ان خطوط میں ہے۔[۳۲]

پھر بابائے اردو نے خطوط شبلی کے متعدد اقتباسات سے خلوص و محبت اور بو کی دلیلیں پیش کی ہیں۔ وہ تقریباً تمام اقتباسات درمیان سے لے کر سیاق وسباق مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، حتیٰ کہ معانی ومفہوم بھی غلط نکالے ہیں۔ استنباط نتائج میں بھی غلطی کی ہے، لیکن خوبی یہ ہے کہ درمیان میں بعض ایسے اقتباسات بھی درج کئے ہیں، جن سے قاری یہ سمجھے گا کہ وہ صرف خلوص ہی کی بات نہیں کر رہے ہیں، علمی و تعلیمی اور ادبی نکتے پر بھی ان کی نظر ہے۔ حالانکہ یہ سب انھوں نے اس لئے نقل کئے ہیں کہ وہ جو محل تعمیر کرنا چاہتے ہیں، سب اس کے نقش و نگار کے کام آئیں۔ مثلاً ان خطوط میں خواتین کی تعلیم و تربیت پر جو خیالات آگئے ہیں ان کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، لیکن ساتھ ہی راز و نیاز کی باتیں بھی دکھائی ہیں تا کہ وہ جو ثابت کرنا چاہتے ہیں، قاری کا ذہن اس سے نہ ہٹے۔ جیسے جہاں ''شخص'' کا لفظ استعمال کرنا چاہئے وہ وہاں پر ''مرد'' کا استعمال کرتے ہیں تا کہ شخص سے شخصیت کا پہلو نہ نکلے بلکہ ''مرد'' سے عورت اور مرد کا تصور سامنے آئے۔ اسی طرح علامہ شبلی نے عطیہ فیضی

---

[۳۲] خطوط شبلی، ص: ۱۷

کے اندر ادبی مذاق پیدا کرنے کے لئے جو اشعار یا غزلیں ان کو بھیجیں، اس سے وہ وہی مفاہیم نکالے جو علی العموم غزلوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر لکھتے ہیں:

ان خطوط سے جیسا کہ میں شروع میں لکھ چکا ہوں محبت اور خلوص کی بو آتی ہے۔ اس سے قبل مولانا کے رقعات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن وہ اس داستان سے خالی ہیں۔ محبت کے ولولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف لینا ہو تو ان رقعات کو پڑھنا چاہئے۔ یہ وہ جوہر ریزے ہیں جو ہمارے ادیبوں اور انشاپردازوں کے کلام میں مشکل سے ملیں گے اور اگر ہیں بھی تو یا تو فرضی اور بناوٹی یا پایہ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔[۳۳]

ہمیشہ اور ہر ادبی و تنقیدی معاملہ میں مولانا حالی سے علامہ شبلی کا موازنہ کر کے علامہ شبلی کو ہیچ ثابت کرنے والا اندازہ کریں کہ کس طرح داد دے رہا ہے اور ابتدا میں خلوص و محبت کی جس بو کا ذکر کیا تھا، کیسے کیسے آہستہ آہستہ اس کو ایک داستان بناتا جا رہا ہے۔ وہ اس کے بعد خطوط سے چند اقتباسات نقل کر کے اس داستان کو اور بھی رنگین بناتے ہیں۔ بعد ازاں احتیاطاً چند جملے جن سے عطیہ فیضی کی تربیت مقصود ہے وہ بھی نقل کرتے ہیں تاکہ سیدھا ان پر الزام نہ عائد ہو سکے۔

یہ رنگین داستان کی تخلیق دراصل علامہ شبلی کی بلند اور عظیم المرتبت شخصیت کو نیچا دکھانے کی ان کی اس کوشش کا انجام ہے جو انھوں نے گلشن ہند کے مقدمے سے شروع کی تھی۔ یہ خطوط ان کے لئے آخری تیر ثابت ہوئے۔

بابائے اردو نے خلوص و محبت کی جو بو محسوس کی تھی دراصل اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے دوست حسن علی آفندی کی بیٹیوں سے کام لینے کے لئے بڑی شفقت و مروت کا معاملہ کیا ہے اور اس شفقت آمیز رویے کو بابائے اردو، جو خود خلوص و محبت کی بو سے مدۃ العمر ناآشنا رہے، اسی غلط انداز میں محسوس کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایک آخری دلیل یہ بھی دی کہ علامہ شبلی اکل کھرے اور تنگ مزاج تھے۔ باوجود اس کے انھوں نے کس درجہ نرم اور سبک انداز ان خطوط میں اختیار کیا ہے۔ مگر بات اس سے بھی نہیں بنتی۔ مکاتیب شبلی کے متعدد مکتوبات سے اسی انداز کا احساس عام ہے اور وہ علامہ شبلی کے حسن و سلوک اور انتہائی دلفریب انداز نگارش سے مزین ہیں۔ مقدمے کے آخر میں ان کی حسرت و تمنا نے الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے:

---

[۳۳] خطوط شبلی، ص: ۲۴

مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا۔ وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔ لیکن بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انھیں میں یہ خطوط ہیں۔[۳۴]

ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہو سکی۔ آج وہ ہوتے تو دیکھتے کہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کا جلوہ ہندوستان سے آگے نکل کر عالم اسلام کو متحیر کر رہا ہے اور ان کی حیثیت ایک علمی رہنما کی قائم ہو چکی ہے۔ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں تصانیف شبلی کے ۱۴۲ ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور ایک ایک کتاب کے پچاس پچاس ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ شاید اسی بنا پر انھیں آخر میں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا اور انھوں نے پاکستان جانے کے بعد علامہ شبلی کی تعریف و تحسین شروع کی اور ایک موقع پر جب عبداللطیف اعظمی (۱۹۱۷-۲۰۰۲ء) نے ان سے ان کی مخالفت کا سبب پوچھا تو انھوں نے سرے سے مخالف ہونے ہی سے انکار کر دیا اور لکھا کہ یہ صریحاً غلط ہے۔[۳۵]

اس مقدمے سے علامہ شبلی کی شخصیت کو نقصان ضرور پہنچا، مگر خطوط شبلی میں ایسا کچھ نہ تھا جو بیان کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خطوط آج سب کے سامنے ہیں اور ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بابائے اردو کا مقدمہ پڑھے بغیر ان خطوط کو پڑھا جائے۔

اس مقدمے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ذہن کو غلط راہ پر ڈال دیتا ہے اور صحیح نقطۂ نظر قائم نہیں ہونے دیتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو لوگ مقدمہ پڑھیں وہ ڈاکٹر ابن فرید کا مقالہ ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' کا بھی مطالعہ کریں جس میں انھوں نے بابائے اردو کے غلط رخ کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مقالہ ان کی کتاب 'میں، ہم اور ادب' میں شامل ہے۔

اس مقدمے کے بعد بابائے اردو نے علامہ شبلی کے خلاف کوئی قابل ذکر کام تو نہیں کیا بلکہ انھیں کرنے کی بھی اب ضرورت نہیں تھی۔ انھوں نے ایک لائق جانشین پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ منشی محمد امین زبیری نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا اور کئی کتابیں لکھیں۔ اس کا حاصل ڈاکٹر وحید قریشی (۱۹۲۵-۲۰۰۹ء) کی کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' ہے جو ۱۹۵۰ء میں لکھی گئی۔ گویا بابائے اردو نے علامہ شبلی کے خلاف جو مہم چھیڑی تھی وہ تقریباً پچاس برس قائم رہی، لیکن جس کو اللہ رکھے اس کو

---

[۳۴] خطوط شبلی، ص: ۳۶

[۳۵] ادیب، شبلی نمبر، ص: ۱۲

کون جھکے۔آج علامہ شبلی اوران کے کارنامے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے روشن باب کا حصہ ہیں اور تراجم کے ذریعہ ان کی کاوشیں افغانستان، ایران، ترکی، سعودی عرب، بیروت، مصر حتیٰ کہ دوشنبے تک پہنچ گئی ہیں۔ایران کے ایک شخص سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے پوری زندگی تصانیف شبلی کے فارسی تراجم کرنے میں گذار دی اور یہ سلسلہ ترکی، بیروت اور مصر میں اہل قلم یوسف پراچہ اور ڈاکٹر سعید حفناوی کے ذریعے آج بھی جاری ہے۔ کیا اسی کو ''لونی لگنا'' کہتے ہیں؟ اور اگر یہی لونی ہے تو ابھی اور لگے گی۔

مشہور نقاد انجم اعظمی نے بابائے اردو کی مخالفت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> مولوی عبدالحق ساری زندگی شبلی کو سرسید کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ حالانکہ سرسید کا شبلی سے بڑا مداح پیدا ہی نہیں ہوا۔ شبلی کی نظم و نثر دونوں ہی اس کی گواہ ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ سرسید سے انتہائی عقیدت کے باوجود شبلی ان سے دوسروں کی نسبت زیادہ ہی اختلافات رکھتے تھے۔ لیکن اختلاف رائے کو مخالفت اور دشمنی سے جاملانا مولوی عبدالحق جیسی نامور شخصیت کا کام تو ہو سکتا ہے جو شبلی سے کچھ ذاتی پرخاش بھی رکھتے تھے۔ مجھ جیسا معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا یہ جرأت نہیں کر سکتا۔[۳۶]

[۳۶] ادب اور حقیقت، ص: ۲۲۸-۲۲۹

تذکرۂ عالم

تاریخ کا دلچسپ وثیقہ

عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین کے کتب خانہ کی محفوظہ کتابوں میں اچانک ایک کتاب پر نظر پڑی، جس کی غیر معمولی تقطیع نے اس کو دیکھنے پر مجبور کیا۔ ۱۷.۵ x ۱۰.۵ سائز کی اس کتاب پر سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کی تحریر بھی کتاب کی اہمیت کا اعلان کر رہی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''ہدیہ از جناب راجہ اعظم شاہ صاحب زاد لطفہ برائے کتب خانہ دارالمصنّفین، سید صباح الدین عبدالرحمن ۹؍دسمبر ۱۹۸۰ء''۔ راجہ اعظم شاہ کی ہستی اعظم گڑھ کے راجاؤں کی آخری بڑی شخصیت تھی جن کو دیکھنے اور سننے کی عزت ہم کو بھی ملی۔ ان کے خاندان اور وارثین کا ذکر یہاں مقصود نہیں، اعظم گڑھ کی جتنی اور جیسی تاریخیں لکھی گئیں، ان سب میں اس نو مسلم راجپوت خاندان کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ محلہ قلعہ شاید عرصہ دراز تک ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ اعظم شاہ نے اگر ایک کتاب بطور خاص دارالمصنّفین کے کتب خانہ کے لیے ہدیہ کی تو اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی۔ اسی وجہ کو پانے کے لیے کتاب کی ورق گردانی کی خواہش ہوئی۔ سرورق کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں چھپی اس کتاب کا یہ سرورق اپنی رنگین مصوری اور دیدہ زیبی کی وجہ سے کچھ منفرد ہے۔ نہایت خوبصورت اور جلی کتابت میں کتاب کا نام ''تذکرہ عالم'' اور نیچے یہ تحریر ہے: میور پریس دہلی محلہ پیپل مہادیو میں باہتمام منشی بلاقی داس صاحب طبع ہوا۔ باریک خط میں ۱۹۰۹ء اور کتبہ محمد احمد بھی موجود ہے۔

قریب سوا سو سال قبل شائع ہونے والی اس کتاب کو ظاہر ہے کہ قدیم مخطوطات یا مطبوعات میں شامل نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ اس لحاظ سے نایاب یا کم یاب ضرور ہے کہ اس کا ذکر کم ملتا ہے، ہمارے کتب خانہ کے حصہ تاریخ میں بھی اس کا ذکر نہیں، دوسرے کتب خانوں کی خبر لینے کی صلاحیت نہیں، اس کے باوجود یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ عالم کے ایک دور پر اپنی قسم کی ایک جدا کتاب ہے۔

جدا کہنے کی وجہ دوسرے صفحہ پر التماس مولف کے عنوان سے ایک گفتگو ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ عالم کے طابع و ناشر منشی بلاقی داس کارخانہ میور پریس کے مالک بھی ہیں اور اس کتاب کے مولف بھی وہی ہیں۔ لیکن اصل دلچسپی کا سامان تو ان کے التماس میں ہے، اور یہ واقعی اس

لائق ہے کہ اس کا خلاصہ بیان کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ یہ کامل صورت میں نقل کردیا جائے۔ سوا سو سال بعد کے قارئین کے لیے اس التماس کا اختصاص کم نہیں ہوسکا ہے۔ منشی بلاقی داس لکھتے ہیں:

> ناظرین والا تمکین پر واضح رہے کہ رسالہ ہذا میں جو تصاویر شاہان و خواتین سلف کی آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں، یہ عام معمولی فرضی تصاویر نہیں ہیں بلکہ یہ خاص ان مستند مرقع حیات قلمی شاہی سے نقل کی گئی ہیں کہ جن کی تلاش و جستجو میں مولف کا بہت بڑا حصہ اور ہزار ہا روپیہ صرف ہوا ہے۔ شاید مبالغہ تصور ہوگا کہ جو نادر اور کمیاب ذخیرہ تصاویر قلمی کا مولف نے چالیس سال کے اندر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں و دیگر ولایتوں سے بہم پہنچایا ہے یہ ایک ایسا نادر اور بے بہا لائق دید اور قابل قدر ذخیرہ ہے جس کے ملاحظہ کو جرمن، فرانس، انگلینڈ و اٹلی وغیرہ ولایتوں سے اکثر یوروپین صاحبان تشریف لاکر اس نادرالوجود ذخیرہ کی ایک ایک تصویر کو سینکڑوں روپیہ قیمت پر خرید کرنے کی آمادگی ظاہر فرماتے رہے ہیں۔ مگر مولف نے کسی تصویر کی علاحدگی کو کبھی پسند نہیں کیا، حتی کہ ایک مرتبہ ایک صاحب باشندہ جرمنی جو اعلیٰ درجہ کے قدرداں اور جوہر شناس تھے، تشریف لائے اور بعد ملاحظہ کل ذخیرہ کے معاوضہ میں ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار ہوئے۔ مگر مولف نے اس رقم کی منظوری سے محض اس خیال سے انکار کردیا کہ جس محنت اور جانفشانی سے تو نے یہ ذخیرہ فراہم کیا ہے اور جس کی دید کا ہر شخص مشتاق نظر آرہا ہے ایک دم اہل ہند کی نظروں سے غائب ہوجاوے گا، کیا خوب ہو کہ جہاں ان مرقعہ جات کی فراہمی میں اس قدر محنت و مشقت اٹھائی گئی ہے وہاں کچھ اور بھی زیادہ بار اپنے اوپر اٹھایا جاوے اور ان نادرالوجود مرقعہ جات کو اسی قلمی شان و شوکت کے ساتھ مع ان کی لائف کے رنگین چھاپ کر شائقینانِ ہند کی خدمت میں پیش کیا جائے تاکہ ہمیشہ کے لیے یادگار زمانہ رہے۔
>
> پس اب مولف کے ناظرینان کی خدمت میں رسالہ ہذا پیش کر کے امید رکھتا ہے کہ وہ بچشم انصاف اس کے تاریخی دلچسپ مضامین اور تصویرات رنگین کو ملاحظہ فرماکر مولف کی قدر افزائی فرمائیں اور اگر کوئی سہو یا خطا ہو تو اوس کو اپنے سایۂ ملاطفت میں ڈھانپ کر معاف فرمائیں گے۔
>
> بر رسولان بلاغ باشد و بس

ہمارے لیے اس التماس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہ جاتی، البتہ قدر و اعتراف کے کلمات کی بہر حال گنجائش ہے کہ گذشتہ صدی کے اوائل میں اردو کے آسمان پر زبان، شعر و ادب، تاریخ، تذکرہ کے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب گردش میں تھے اور نئے سیاروں کی تلاش بھی کس طرح جاری تھی، اردو فرقوں کی زبان نہیں تھی ملک کی زبان تھی اور ایک اردو والا مذہب و علاقہ سے بے تعلق ہو کر کس طرح عمر اور دولت دونوں کو بے دریغ صرف کرسکتا تھا۔ علم سے وابستگی اور اس پر فخر و ناز کو فروخت کرنے کے جدید ترین

تجارتی مزاج کی اس وقت آہٹ تک نہیں تھی، بس ایک تمنا ایسے کارناموں کے پس پشت کارفرما ہوتی کہ ''یہ خدمت ہمیشہ کے لیے یادگار زمانہ بن جائے''۔

منشی بلاقی داس کون تھے، ان کے اور کارنامے کیا ہیں، ان کے وقت کے مشاہیر خصوصاً دلی والوں سے ان کے روابط کیسے تھے، ان کے میور پریس کی کیا شان تھی اور خود منشی صاحب کے اس تمول کے اور مظاہر کیا ہیں، جس کی ایک ہی مثال ''ہزارہا روپیہ صرف کرنے کی ہے''۔ یہ سوالات تحقیق طلب ہیں اور تحقیق مشقت طلب ہے۔ تاہم شاید کوئی باہمت یہ حوصلہ کرہی لے۔

اب اصل کتاب پر ایک نظر کی ضرورت ہے، پہلے صفحہ کی پہلی سرخی تیمور یا تمر لنگ ابن امیر طراغان کی ہے۔ فہرست شاید اس وقت اتنی ضروری نہیں تھی اس لیے قاری کے سامنے پہلی نگاہ میں کتاب سے اجمالی تعارف کی صورت نظر نہیں آتی لیکن تذکرہ عالم میں امیر تیمور کے نام سے آغاز ظاہر کرتا ہے کہ یہ داستان تیموریوں کی ہے اور ہندوستان میں بزم تیموریہ جن سے آراستہ ہوئی، اس تذکرہ میں چراغاں ان ہی کا ہونا ہے۔ یہاں مغل دور کی اور تاریخوں سے اس کتاب کے موازنہ کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس تذکرہ عالم میں محض تیموری حکمرانوں کا ذکر نہیں ان کی نامور بیگمات کا ذکر بھی ان کے شاہوں کی شان سے کم نہیں، تیمور کا ذکر ساڑھے تین صفحات میں آیا ہے۔ منشی صاحب لکھتے ہیں کہ تاریخ یدعی المنتخب والا لکھتا ہے کہ امیر تیمور کا باپ سلطان حسین کے ہاں اعلیٰ درجہ کا ملازم تھا۔ اسی طرح آگے منشی صاحب ایک مورخ کا قول نقل کرتے ہیں، اور حوالہ تاریخ تیموری کا دیتے ہیں، یعنی کبھی وہ بغیر کسی نام کے حوالہ سے واقعات کا ذکر کرتے ہیں، کبھی کتاب کا ایسا نام بتاتے ہیں کہ نام صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے اور مصنف کا تو نام ہی نہیں ملتا۔ البتہ کہیں یوں بھی لکھتے ہیں کہ الفنسٹن صاحب اپنی تاریخ ہند میں تحریر کرتے ہیں کہ گو تیمور کی فتوحات کی وسعت کچھ کم نہ تھی مگر چنگیز خاں کے برابر اس کی فتوحات نے ہاتھ پیر نہیں پھیلائے، پھر بھی جس بے جگری سے اس نے فتوحات کی ہیں وہ سکندر کی فتحوں سے زیادہ سخت ہیں۔ اسی طرح وہ الفنسٹن صاحب کے حوالے جابجا دیتے نظر آتے ہیں، مگر وہ آج کے حوالہ جاتی معیار اور رواج سے کہیں میل نہیں کھاتے۔ تیمور کا ذکر قریب تین صفحوں میں اس طرح ہے کہ خوں ریزی اور سفاکی سے گویا ہر سطر اور ہر بیان لہولہان ہے لیکن علم اور علماء کی قدر اور ان کا احترام، تیمور نے جس طرح کیا اس کا بھی ذکر کیا گیا، گو یہ مختصر ہے۔ اسی سیاق میں علامہ نصیرالدین کا واقعہ بڑے دلچسپ انداز میں نقل کیا کہ علامہ جب تیمور کے سامنے آئے تو تیمور ٹانگ پھیلا کر بیٹھا تھا۔ نصیرالدین نے کہا کہ مجھے ایسے بے ادب بادشاہ کے دربار میں کیوں لایا گیا۔ اسی غصہ میں علامہ کے لیے

جو کرسی تھی، اس پر بیٹھنے کے بجائے وہ بھی تخت پر پیر پھیلا کر بیٹھ گئے۔ تیمور کے سامنے کوئی اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر منشی بلاقی داس کے الفاظ میں تیمور کا متحمل مزاج اس گستاخی کو سنبھال گیا اور آہستگی میں کہا کہ ''مر النگ است''۔ علامہ نے فوراً جواب دیا کہ ''مر اننگ است''۔ لکھتے ہیں کہ اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ تیمور کیسا علم دوست تھا اور ایسے ناواجب موقع پر بھی کیسا تامل کیا کرتا تھا۔ ساڑھے تین صفحات میں تیمور کے ذکر کو کافی سمجھنے والے منشی جی نے تیمور کی بیگمات کے لیے قریب اٹھارہ صفحات خاص کر دیے۔

ان میں اس کی چوتھی اور قدرتاً سب سے چہیتی بیوی حمیدہ بانو بیگم کی حیات ساڑھے چودہ صفحات میں ہے، باقی تین بیگموں مسیحی بانو بیگم، عظمت النساء بیگم اور فخر النساء بیگم کے حالات کے لیے بس دو تین صفحات رکھے گئے۔ درمیان میں کتاب کے سائز کے مطابق تیمور اور حمیدہ کی رنگین تصویریں ایسی ہیں جیسا ان کے بارے میں مولف کا دعویٰ ہے، یہ قلمی تصویریں اپنے حد درجہ بلند مہارت، ہنر اور رنگ اور نزاکت ونفاست میں شبیہ خاص کہلانے کا صحیح دعویٰ کرتی ہیں۔ پریس کی مشینوں سے ان کا گزر شاید اس احتیاط سے ہوا کہ ان کو قلمی کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔

تیئیسویں صفحہ پر جلال الدین میران شاہ ابن تیمور صاحبقران کا ذکر اور پھر اس کی تصویر ہے اور اگلے صفحہ پر میران شاہ کی بیگم گیتی آرا عرف مہ وش کی تصویر ہے اور اس کے حالات بھی ہیں۔ میران شاہ کی زوجہ دوم انطاکیا بیگم اور پھر باقی بیگمات مریم اور حفصہ اور شلتاقی یا چنگیزی بیگم کے احوال ہیں۔ اسی طرح محمد میرزا ابن جلال الدین میران شاہ، سلطان ابوسعید میرزا ابن سلطان محمد میرزا، عمر شیخ میرزا ابن ابو سعید مرزا کی بیگمات کا ذکر ان کے شوہروں سے زیادہ حصہ لیے ہوئے ہے۔ عمر شیخ مرزا کی قتلق نگار بیگم، بادشاہ بابر کی والدہ ہیں۔ ان کے بعد ظہیر الدین محمد بابر شاہ غازی کا ذکر آتا ہے اور اصل بزم تیموریہ کے بام ودر کی رونق بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ظہیر الدین محمد بابر، نصیر الدین ہمایوں بادشاہ، جلال الدین محمد اکبر، نور الدین جہانگیر شاہ، شاہ جہاں بادشاہ، اورنگ زیب عالم گیر، بہادر شاہ، جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، شمس الدین رفیع الدولہ، محمد شاہ رنگیلے، احمد شاہ، عالم گیر ثانی، شاہ عالم، اکبر شاہ متوفی ۱۲۵۳ھ اور ان کی بیگمات ماہم یا اختر زمانی، حمایت النساء بیگم، حمیدہ بیگم، حاجی بیگم، جودہ بائی، سلیمہ سلطانہ، مریم یا میری، عارف النساء، شنتلی رانی، سعیدہ بانو، نور جہاں بیگم، آرام جان بیگم، حیات النساء بیگم، فنات النساء بیگم، نواب بائی، دل رس بانو بیگم، سروپی، مسیح النساء، زینب، نظام بائی، شیریں لقا، فقر النساء، مہر النساء، گیتی آرا بیگم، گوہر، شاہد بازاری، احمد النساء، خجستہ سلطانہ بیگم، سرہندی بیگم، فتحپوری

بیگم، بیگم شاہ رخ، بیگم قدسیہ، بیگم خورشید زمانی، مبارک بیگم، انور جہاں بیگم، احترام النساء بیگم، لعل کنور ملقب بہ زینت محل، اکبری بیگم، امیر زمانی بیگم، ہمایوں زمانی بیگم، گورگانی بیگم، مس ہنری، نواب قدسیہ بیگم ثانی، مبارک محل کھولی بیگم، زبدۃ النساء بیگم، لعل بائی یا کلو بائی پر ختم ہوتی ہے۔ان میں قریب تمام نمایاں بیگمات کی تصویریں بھی ہیں۔اکبر شاہ کے متعلق لکھا ہے کہ ''ان کے اٹھارہ بیٹے تھے مگر وہ کچھ مشہور نہیں ہوئے۔فطری طور پر جب مسلمانوں کی سلطنت میں زوال آیا تو اور اس کے ساتھ ہی ان کی عزت و حرمت اور غیرت و حمیت کا بھی زوال ہو گیا۔یہ آفت جو لعل قلعہ پر گھٹا ٹوپ اندھیروں کی طرح ہر چہار طرف سے چھائی ہوئی تھی اس سے زیادہ اور کہیں زیادہ لکھنؤ کی کیفیت تھی....اکبر شاہ گو آصف الدولہ کی طرح صاحب دولت تو نہیں تھے مگر آصف الدولہ کی نسبت مفلس بہت تھے۔پھر بھی جناب کی بیگموں کی تعداد ٹھیک ٹھیک مقرر نہیں تھی، جس ماما اصیل پر نظر پڑ گئی وہی بیگم بن گئی''۔ ایک جگہ اس وقت کے اس قسم کے حالات پر بلاقی داس نے یہ مثل دہرائی کہ:

آدمیان گم شدند ملک خدا خر گرفت

دو سو چونسٹھ صفحات کی اس کتاب کے آخری صفحہ کا آخری اقتباس منشی بلاقی داس کے فہم تاریخ کا اندازہ لگانے کے لیے پیش کیے جانے کے لائق ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے تک کسی بادشاہ کی چار سے زیادہ بیگمات نہیں ہوئیں۔ان چار میں بھی ملکہ زمانی کا خطاب ایک ہی کو ہوتا تھا گویا ایک ہی بیگم شمار کی جاتی تھی اور باقی بیگمات کے لقب سے خارج ہوتی تھیں۔عالم گیر تک مغلیہ خاندان کے بادشاہ اپنی روزی اپنی ریاضت سے پیدا کرتے تھے اور اسی پر ان کو بڑا ناز و فخر تھا۔یہ کس کو معلوم تھا کہ عالم گیر کے انتقال کے دس برس بعد ہی سلطنت مغلیہ کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور پندرہویں سال اس کی بنیادیں ہل کر بائیسویں برس وہ جڑ سے اوکھاڑ کر پھینک دی جائے گی۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم بہار آخر شد

اس کتاب کے اول و آخر سے زیادہ شوق اس کا تھا کہ اورنگ زیب عالم گیر کے بارے میں منشی بلاقی داس ۱۹۰۹ء کے آس پاس کے زمانہ میں کیا لکھتے ہیں۔ان کے تاریخی مصادر کیا ہیں اور اخذ و قبول میں ان کا معیار کیا ہے۔یوروپیوں کی طرح تعریفوں کے پھول برساتے ہوئے اچانک سنگ باری کا احساس تو ان کی تحریر میں نہیں ہوتا اور آخر کیا وجہ ہے کہ دوسرے مورخین کے برخلاف ان کے مطالعہ و تذکرہ کا مرکزی عنوان بادشاہوں کے بجائے بیگمات پر کیوں ہے؟ منشی بلاقی داس کیا واقعی ایک مستند راوی و ناقل کا درجہ رکھتے ہیں؟

یا اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ''تیمور کا چال چلن یا اس کی طبعی حالت پر غور کریں گے تو ہمیں نہ ان کے مداح مورخوں کے اقوال سے سند لینی پڑے گی اور نہ ہم ان فرامین کو مطالعہ کرکے رائے قائم کریں گے کہ جن سے اس کا پر شوکت نظام معلوم ہوتا ہے بلکہ ہمیں فرض ہے کہ ہم اس کے کاموں کی طرف توجہ کریں اور اس کے افعال کی فطرت کو سمجھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے مزاج کی کیا کیفیت تھی''؟ ان سوالات سے منشی بلاقی داس کے مطالعہ کا منہج خود بخود متعین ہوتا جاتا ہے، وہ ملفوظات تیموری کا حوالہ دیتے ہیں مگر یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ ملفوظات وہ ہیں جن کا میجر اسٹوارٹ نے ترجمہ کیا ہے۔ میجر اسٹوارٹ ہوں یا جانسن صاحب یا ہابرٹ یا مل مین اور اس کی کتاب دی گریٹ کانکرر آف ایشیا، اس قسم کے یوروپی مصنفین و مصنفات کا ذکر بتاتا ہے کہ منشی بلاقی داس کی نظروں سے یہ کتابیں گزری ہیں اور انہوں نے ان کے طرز فکر کو بھی متاثر کیا ہے۔ جابجا ایسی مثالیں ہیں جو شاید آگے چل کر محمد ار اور کالکا رنجن قانون گو جیسے مورخوں کے لیے نمونہ بن گئیں۔ ایسے میں بابر، اکبر اور اورنگ زیب کے متعلق ان کے ذخیرہ معلومات و روایات میں کیا ہے، اس کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ اگر مہلت ملی تو تذکرہ عالم کی ایسی داستانوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ راقم چوں کہ تحقیق کی موجودہ وادیوں سے زیادہ آشنا نہیں اس لیے وہ اس کتاب کے متعلق ماہرین کی معلومات سے استفادہ کی توقع کرتا ہے۔

گلستانِ علم وادب کی بہار

ظفرالباری مرحوم(۳؍ستمبر۱۹۴۰ء-۳؍نومبر۲۰۲۱ء)

نعمان بدر فلاحی

ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

nomanbadaralig@gmail.com

جگر میموریل انٹر کالج، گونڈہ کے سابق لکچرر ظفرالباری صاحب مرحوم کا آبائی وطن مردم خیز سرزمین اعظم گڑھ کے موضع بسہم کے نزدیک واقع گنگا پور گودام تھا جو زمین داری کے زمانے میں ایک چھاؤنی ہوا کرتی تھی۔ ان کے والد ماسٹر التفات احمد علیگ (۱۹۰۱ء-۲۷؍مارچ ۲۰۰۴ء) تھامسن کالج (Thompson College) گونڈہ میں لکچرر، جماعت اسلامی کے ایک فعال رکن اور اردو اور ہندی میں تقریباً ۱۰ کتابوں کے مصنف تھے، جبکہ نانا حامد حسن علوی (۱۸۷۱ء-۱۹۵۹ء) ایک بلند پایہ شیخ طریقت، حافظ قرآن، قاری اور صوفی منش انسان تھے۔ ظفرالباری صاحب کی ولادت اپنے نانھیال موضع کوہنڈہ (ضلع اعظم گڑھ) کے ایک دینی، علمی، اور روحانی خانوادہ میں ۳؍ستمبر ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ وہ اپنے ۹؍بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔[1]

تعلیم اور ملازمت

ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد ۱۹۵۲ء میں مرکزی درسگاہ اسلامی رامپور میں درجہ سوم میں داخلہ ہوا۔ سابق قیم جماعت اسلامی ہند افضل حسین صاحب علیگ اس وقت درسگاہ کے ناظم اور اسلام اللہ پریمی بورڈنگ ہاؤس میں اتالیق تھے۔ مولوی محمد ایوب اصلاحی، مولانا سلیمان قاسمی، ماسٹر عبدالوحید، ماسٹر عبدالوھاب، ماسٹر شوکت علی (جو بعد میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے) وغیرہ اُس زمانے کے قابل ذکر اساتذۂ کرام میں شامل تھے۔ ایسے عالی مرتبت، فاضل اور مربی اساتذہ کی صحبت اور تعلیم تربیت

---

[1] آئینۂ اویسی، محمد مطیع الرحمان، پٹنہ کالج، لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ پٹنہ ۴۔ سن اشاعت مارچ ۱۹۷۶ء؛ مرشدنا، مولانا محمد سعید خاں، جید برقی پریس، بلی ماران دہلی، سن اشاعت ۱۹۵۴ء؛ سوانح حیات حضرت حامد حسن علویؒ، مولانا آزاد رسول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر نئی دہلی، ۲۵۔

نے ان کی ذہنی، علمی اور عملی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اس زمانے میں جماعت اسلامی ہند کا مرکز رامپور میں تھا اور امیر جماعت مولانا ابو اللیث ندوی کے علاوہ صدر الدین اصلاحی، مولانا سید حامد علی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا عروج احمد قادری اور شفیع مونس صاحبان وغیرہ وہیں قیام کرتے تھے۔ اِن حضرات کی نگرانی اور سرپرستی میں درسگاہ میں تعلیم وتربیت کا ایک معیاری نظام قائم تھا۔

بدقسمتی سے رام پور کی آب وہوا انہیں راس نہیں آئی۔ طبیعت کی مسلسل خرابی کے سبب ۱۹۵۴ء میں درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد رام پور سے واپس گونڈہ آ گئے۔ ایک سال پرائیوٹ ٹیوشن کے ذریعہ تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۶ء میں تھامسن کالج میں نویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ ۱۹۵۷ء میں ہائی اسکول مکمل کر لیا تھا مگر طبیعت مسلسل خراب رہنے کی وجہ سے درمیان میں دو سال کا وقفہ رہا۔ ۱۹۶۲ء میں تھامسن کالج سے ۱۲/ ویں کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۳ء میں BSc کے لیے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں شیعہ کالج میں داخل ہوئے جو لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ ۱۹۶۸ء میں بی ایس سی کی تکمیل کے بعد اُن کا نکاح موضع ڈھلئی فیروز پور ضلع اعظم گڑھ میں علی اختر صاحب مرحوم (متوفی جنوری ۱۹۷۷ء) کی دختر فہمیدہ سعدیہ صاحبہ کے ساتھ ہو گیا تھا۔

۱۹۷۰ء میں عروس البلاد بمبئی کا قصد کیا اور وہاں ایک سال بیگ محمد ہائی اسکول میں سائنس، ریاضی اور بایولوجی کے استاد رہے۔ دوسرے سال پنوِل میں واقع یعقوب بیگ ہائی اسکول میں تقرری ہوئی۔ ۱۹۷۲ء میں ممبئی یونیورسٹی سے بی ایڈ کی سند حاصل کی اور ۷۴ء میں رئیس ہائی اسکول بھیونڈی میں مستقل استاد کی حیثیت سے تقرری ہو گئی جہاں وہ طلبہ کو سائنس پڑھاتے تھے۔ ۱۹۸۴ء میں بھیونڈی میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر جگر میموریل اسکول گونڈہ آ گئے جہاں ۲۰۰۱ء میں ملازمت سے سبکدوشی تک مستقل تدریسی خدمت انجام دی۔

علمی، ادبی اور سماجی خدمات

ظفر الباری صاحب کے اندر علمی ادبی اور شعری ذوق بچپن سے ہی موجود تھا۔ درسگاہ اسلامی رام پور کے زمانے میں بچوں کے تعلیمی اور ثقافتی پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کی ہمشیرہ نزہت یاسمین صاحبہ کہتی ہیں:

وہ بچپن میں پر مزاح شرارتوں کے عادی تھے۔ مجلس اور مشاعرہ سننے ضرور جاتے تھے۔ کسی جلسے اور مجلس میں جو تقریر یا وعظ سنتے، گھر آکر اس کی ہو بہو نقل کرتے۔ کبھی کبھی رات کے گیارہ بجے واپس آتے، والدہ کھانا کھائے بغیر دروازے پر بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہتیں۔ اپنی ذہانت، خوش مزاجی اور مزاحیہ باتوں کی وجہ سے والدین کے نور نظر اور دُلارے تھے۔[۲]

گزشتہ سال اپنی روداد حیات سناتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا تھا:

مرکز جماعت اسلامی رامپور میں افضل حسین صاحب، ابو اللیث اصلاحی اور محمد یوسف صاحب وغیرہ انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ان لوگوں کے یہاں قناعت پسندی اور صبر و شکر بہت زیادہ پایا جاتا تھا۔ بالعموم دو جوڑی کپڑے رہتے تھے، بوسیدہ ہو جاتے مگر وہ لوگ اسے استعمال کرتے رہتے۔ ان لوگوں کی زندگی عہد صحابہ کی مثال پیش کرتی تھی۔

بچپن میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی خطبات نے میرے اوپر خاصا اثر ڈالا تھا۔ ان کی تصنیفات کا پابندی سے مطالعہ کرتا رہا۔ خلافت و ملوکیت ان کی بڑی معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ تنقیحات اور تفہیمات بھی نہایت عالمانہ کتابیں ہیں۔ تفہیم القرآن کے اندر غیر عربی داں اور جدید ذہن رکھنے والوں کو قرآنی افکار و تصورات سے متعارف کرانے اور قرآن کے پیغام کو سمجھانے کی بڑی قوت ہے۔ مولانا مودودیؒ کا طرزِ استدلال اور سائنٹفک اسلوب کے علاوہ ٹکسالی زبان ان کو اپنے عہد کے اسلامی دانشوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ نقن صاحب مولانا کی تمام تحریروں کا بطور خاص مطالعہ اور استفادہ کرتے تھے۔[۳]

ظفر الباری صاحب کے جس علمی، دینی اور روحانی مذاق کی بنیاد درسگاہ اسلامی رام پور میں رکھی گئی تھی، اس کی تعمیر و تہذیب بی ایس سی کے زمانۂ طالب علمی میں لکھنؤ میں ہوئی۔

۱۹۸۶ء میں شیعہ مجتہد سید کلب عابد کی وفات کے بعد لکھنؤ میں منعقد ہونے والی تعزیتی مجلس میں شریک ہوئے اور شرکاء کے اصرار پر مرحوم سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا، یہ ان کی پہلی مجلس تھی۔ ان سے مراسم اور تعلقات بی ایس سی کے زمانے میں ہی قائم ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے محسن نواب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ معروف عالم، مفسر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات (شیعہ) کے صدر سید علی نقی نقوی المعروف 'نقن صاحب' کی علمی مجالس میں شرکت اور کسب فیض کرتے رہے۔

---

[۲] گفتگو۔ نزہت یاسمین زوجہ امتیاز احمد خاں، اعظم گڑھ، بتاریخ ۱۵/نومبر ۲۰۲۱ء

[۳] انٹرویو۔ ظفر الباری صاحب گونڈہ بتاریخ ۱۳/جنوری ۲۰۲۰ء۔

پیام اسلام کی مجلسوں میں فیض آباد اپنے ساتھیوں کے ساتھ انہیں سننے جایا کرتے تھے۔[۴]

جنوری ۲۰۲۰ء میں مجھے اپنی روداد حیات سناتے ہوئے بتایا تھا:

> میں انٹر کے دوران ہی شیعہ علماء کی تقاریر سننے لگا تھا۔ بی ایس سی کے لیے شیعہ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا تو وہاں ان کے علماء سے براہ راست ملاقات، استفادہ اور ان کی مجالس ذکر میں شرکت کا موقع ملا۔ سید العلما مرحوم سید علی نقی معروف بہ نقّن صاحب کی صحبت میں رہنے اور کسب فیض کا موقع ملا۔ بی ایس سی کے زمانے میں کلب عابد کے والد کلب حسین بیمار تھے، ان کی عیادت کے لیے جاتا تھا، استفادہ کا موقع نہیں ملا۔ انجینئر محمد مرزا کی تصنیف ''واقعہ کربلا ۲۴ صحیح الاسناد احادیث کی روشنی میں''، ایک بلند پایہ علمی اور تحقیقی کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر صاحب علم کو کرنا چاہیے۔ نوگاواں سادات (ضلع امروہہ، یوپی) کے مولانا فیروز حیدر سے ملاقاتیں رہی ہیں، ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ وہ ڈپلومہ انجینئر تھے، دین کا علم بعد میں حاصل کیا۔ علی گڑھ میں لال ڈگی روڈ پر ان کی رہائش تھی۔

مجالس کے لیے برطانیہ اور امریکہ سے دعوت نامے موصول ہوئے، مگر ویزا کے مسائل کی وجہ سے سفر ممکن نہیں ہوسکا۔ ۱۹۹۶، ۹۷، ۹۸ء اور ۲۰۰۴ء میں پاکستان کا سفر کیا اور کراچی، خیرپور، سکھر وغیرہ میں منعقد ہونے والی مجلسوں میں ذاکر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اندرونِ ملک بمبئی، کلکتہ، پٹنہ، مظفرپور، گورکھپور، بستی، لکھنؤ، علی گڑھ، کانپور، دہلی، اعظم گڑھ، بنارس، الٰہ آباد، جونپور اور گونڈہ وغیرہ میں مجالس میں شرکت کے لیے مستقل مدعو کیے جاتے تھے۔ ۲۰۰۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سیرت کمیٹی کی جانب سے ۱۲؍ ربیع الاول کو منعقد ہونے والے سالانہ جلسۂ سیرت میں مدعو کیے گئے تھے جہاں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے گمنام اور نسبتاً کم معروف گوشوں پر حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی۔

۱۹۶۷ء میں جگر اسکول کی انتظامی کمیٹی کے تاسیسی رکن بنادیے گئے۔ چنانچہ رٹائرمنٹ کے بعد اپنے بڑے بھائی اور سابق ایم ایل اے جناب فضل الباری (۲۷؍ جولائی ۱۹۳۸ء-۲۶؍ اکتوبر ۲۰۱۱ء) کے ساتھ مل کر کالج انتظامیہ اور کمیٹی میں ایماندار اور مخلص افراد کی شمولیت کے لیے باضابطہ کئی سالوں تک ذاتی خرچ پر قانونی کارروائیوں اور مقدمات کی پیروی میں دن رات الجھے رہے تاکہ کالج میں نئے اساتذہ

---

[۴] حکیم سید علی حیدر زیدی: حیات وخدمات، مرتب سید صادق حیدر زیدی گہر، ناشر، سید باقر حیدر زیدی سکندر پور، ضلع امبیڈکر نگر، یوپی، سن اشاعت ستمبر ۲۰۰۴ء۔

کی تقرری رشوت، تعلقات اور اثر ورسوخ کی بنیاد پر نہ ہو بلکہ تقرری صلاحیت اور میرٹ کی بنیاد پر ایمان داری سے ہو۔ جگر میموریل انٹر کالج کی فلاح و بہبود اور طلبہ کے روشن مستقبل کے لیے ان کی اس بے لوث قانونی جدوجہد کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔[۵]

گونڈہ شہر میں مسلم عوامی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تو ظفر الباری صاحب کو بھی اس کا تاحیات یا "تاسیسی رکن" بنایا گیا تھا۔ سوسائٹی کے تحت فیض آباد روڈ پر ایک مسافر خانہ اور غیر سودی مسلم عوامی بینک قائم کیے گئے۔

۱۹۷۸ء میں رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کی گولڈن جبلی کے موقع پر ایک مشاعرہ منعقد کروایا تھا جس میں ملک زادہ منظور احمد، انور جلال پوری، شمس مینائی، خمار بارہ بنکوی، بشیر بدر سمیت ملک وبیرون ملک سے ۲۶ ممتاز شعراء شریک ہوئے تھے۔ عرصے تک اُس مشاعرے کی دھوم رہی۔ عوام وخواص کے مطالبہ پر ۱۹۷۹ء میں دوبارہ انڈو پاک مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں دو پاکستانی شاعروں کے علاوہ کنور مہندر سنگھ بیدی بھی تشریف لائے تھے۔ ملک زادہ منظور احمد کے شاگرد انور جلال پوری نے نظامت کی تھی۔ انہوں نے اپنے شہر گونڈہ میں "جگر ڈے" کے موقع پر میونسپل کارپوریشن کے میدان میں متعدد کامیاب مشاعروں کا انعقاد کروایا۔

مرکزی درسگاہ اسلامی رام پور کی یادیں

> ۱۹۵۱ء میں جماعت اسلامی کے پہلے کل ہند اجتماع رامپور میں دس سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ شریک ہوا تھا، وہاں خواتین کے لیے بھی ایک بڑا پنڈال لگایا گیا تھا۔ آئندہ سال ۱۹۵۲ء میں میرا داخلہ درسگاہ اسلامی رامپور میں درجہ سوم میں ہوا۔ جیراج پور ضلع اعظم گڑھ کے مولانا ایوب اصلاحیؒ ہمیں عربی پڑھاتے تھے۔ درجے میں عربی زبان میں ہی گفتگو کرتے۔ وہ ہمارے ابا کے رشتے میں ماموں لگتے تھے۔ اس نسبت سے ہم لوگ انہیں دادا کہتے تھے۔ سلیمان قاسمی صاحب بھی اُس زمانے میں رامپور میں موجود تھے۔ ماسٹر شوکت صاحب ہم کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ وہ ایک بہترین استاد تھے۔ ان کی ایک بڑی بیوہ سالی بھی ان کی اہلیہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے لباس وغیرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ کسی متمول اور اچھے خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[۵] فضل الباری: ایک روشن ستارہ جو ڈوب گیا، نعمان بدر فلاحی، ماہ نامہ افکار ملی، دہلی، دسمبر ۲۰۱۱ء

پرانی کھنڈ سار میں جہاں درسگاہ، مرکز جماعت اور ثانوی کلاسز تھیں، وہیں پر بیڑی کے ایک صاحب خیر اور متمول تاجر بھی تھے جنھوں نے اپنی وسیع و عریض عمارت درسگاہ کو دے دی تھی۔ درسگاہ سے متصل ہی مکتبہ الحسنات کا دفتر تھا۔ اس کے ذمہ دار عبدالحہ صاحب بھی وہیں پر رہتے تھے۔ درسگاہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک گلی میں امیر جماعت مولاناابو للیث ندوی، افضل حسین علیگ، لکھنؤ کے نرسری والے حق صاحب کے بھائی نصیر الحق، محمد شفیع مونس، صدر الدین اصلاحی، قیم جماعت محمد یوسف، اور حامد علی صاحبان وغیرہ کی قیام گاہیں تھیں۔ حامد علی صاحب کی والدہ انتہائی نیک طینت، بزرگ اور صبر و شکر والی خاتون تھیں۔ چونکہ ہم لوگ اس زمانے میں بچے تھے، اس لیے ہم لوگوں سے کہا گیا تھا کہ ذمہ داران جماعت اسلامی کے گھروں میں جاکر پوچھ لیا کرو کہ کوئی ضرورت تو نہیں ہے۔ اُس گلی میں ہم طلبہ ہی جھاڑو لگایا کرتے تھے۔ طلبہ کی کئی ٹیمیں بنائی گئی تھیں، ایک ہفتہ کے بعد دوسری ٹیم جھاڑو لگاتی۔

فجر کی نماز میں تمام طلبہ مسجد میں موجود رہتے۔ مولاناابو اللیث اصلاحی صاحب ہی مسجد کے مستقل امام تھے، اُن کی غیر موجودگی میں یوسف صاحب امامت کرتے تھے۔ یوسف صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ درسگاہ کے بچوں کو سلام میں سبقت کرتے تھے، ہم لوگوں کو بڑی شرم آتی کہ اتنے بزرگ انسان ہم لوگوں کو سلام کرتے ہیں۔ مولانا ابو اللیث صاحب فجر اور عشاء میں طویل نماز پڑھاتے تھے، چھوٹے بچے فجر اور عشاء میں بالعموم جھومتے رہتے، بعض تو سجدہ میں جاکر باقاعدہ سو جاتے تھے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ متعدد ذمہ داران جماعت اپنی تنظیمی مصروفیات اور کاموں کے بوجھ یا زیادتی کی وجہ سے اپنے بچوں کی دینی اور فکری تربیت پر توجہ نہیں دے سکے۔ اُن کا مشاہرہ بہت معمولی تھا، کم سے کم جتنی رقم میں اخراجات پورے ہو جائیں اتنا ہی مشاہرہ ملتا تھا*۔ سب کے یہاں پیسے کی تنگی رہی۔ ان کے بچے جب بڑے ہوئے تو انہیں اپنی معاشی بدحالی کا احساس ہوا۔ چنانچہ وہ ایک دوسری انتہا پر چلے گئے۔ ایک ذمے دار کے بیٹوں نے

---

* اس وقت (تقریباً سنہ ۱۹۶۰) والد صاحب (وحید الدین خانؒ) جماعت اسلامی کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں کام کرتے تھے۔ ان کو ۱۲۰؍ روپئے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جماعت کے دوسرے اہم متفرغ ممبران کو بھی اس وقت تقریباً اتنی ہی تنخواہ ملتی ہو گی جو صرف کفاف کے لئے کافی تھی (ڈاکٹر ظفر الاسلام خان)۔

معاشی تنگی سے جلد باہر نکلنے کے لیے اسمگلنگ کا کام شروع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی شخصیت مجروح ہوئی۔

مسجد سے متصل جماعت اسلامی کا مرکز تھا اور وہیں پر ثانوی درسگاہ بھی تھی جہاں اس زمانے میں گورکھپور کے نجات اللہ صدیقی وغیرہ زیر تعلیم تھے، میں نے انہیں وہاں دیکھا تھا۔ وہیں پر مطبخ بھی تھا جس میں کھانا کھلانے کے لیے طلبہ کی مختلف ٹیمیں بنادی جاتی تھیں۔ اپنی ضرورت کی چیز ہاتھ کے اشارے سے طلب کی جاتی تھی، کوئی بولتا نہیں تھا۔ مثلاً روٹی کے لیے ایک انگلی اٹھاتے، دال کے لیے دو انگلی، اور چاول کے لیے چار انگلی اٹھائی جاتی۔

صبح فجر کے بعد ہم طلبہ رامپور کے قلعہ تک ٹہلنے جاتے تھے۔ واپس آکر ناشتہ کرتے اور پھر تھوڑی دیر میں گھنٹی بج جاتی اور کلاس کا آغاز ہو جاتا۔ چونکہ میں پڑھنے میں شروع سے ہی تیز رہا ہوں اس لیے تمام اساتذہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ ماسٹر عبدالوہاب صاحب ہمارے ایک قابل استاد تھے۔

قاری عبدالواحد صاحب نابینا تھے مگر قرأت و تجوید کے فن میں ماہر استاد تھے۔ دوپہر میں دو طلبہ کی ڈیوٹی لگتی جو اُن کے گھر سے ان کو لے کر آتے اور بعد میں واپس پہنچاتے تھے۔ وہ تجوید کی مشق خوب کراتے تھے۔ سب سے زیادہ دقت ہم لوگوں کو ''ض'' کی ادائیگی میں ہوتی۔ جو طلبہ صحیح مخرج کے ساتھ 'ض' کی ادائیگی نہیں کر پاتے تھے قاری صاحب ان کے منہ میں بے دریغ اپنی انگلی ڈال دیتے اور کہتے ''زبان کی کروٹ کو اوپر کی داڑھ سے لگا کر نکالو 'ضاد'''۔ اُس زمانے میں رامپور کی جامع مسجد میں قاری عبدالاحد صاحب امام تھے، مگر ان کی قرأت اتنی اچھی نہیں تھی۔ قاری عبدالواحد صاحب سورۃ الرحمن کی قرأت بڑے پر سوز اور بہترین لہجے میں کرتے تھے۔ ایک مقامی ڈرائنگ ٹیچر بھی تھے جو اونچی مخملی ٹوپی لگاتے تھے اور ہم لوگوں کو باغبانی بھی سکھاتے تھے۔

افضل صاحب ناظم درسگاہ تھے مگر طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے۔ انہیں عربی کے علاوہ تمام مضامین میں یکساں طور پر عبور حاصل تھا۔ ان کے بیٹے شمس الہدیٰ یا قمرالہدیٰ، ہم سے ایک کلاس آگے تھے۔ درس گاہ کا جو معیار ان کے زمانہ نظامت میں قائم ہو گیا تھا وہ بعد میں باقی نہیں رہا۔ بھوپال میں جماعت کے ذمہ دار انعام الرحمن صاحب کے دو لڑکے بھی اس زمانے میں درسگاہ میں طالب علم تھے۔ حبیب الرحمن ہمارے ہم سبق تھے اور لطیف الرحمن ہم سے بڑے تھے، وہ غالباً چھٹی جماعت میں تھے۔ قیم جماعت یوسف صاحب کے بیٹے

عبد الرحمان بن یوسف اور ابراہیم بن یوسف بھی ہمارے کلاس فیلو تھے۔اُس وقت انگریزی کی تعلیم شروع نہیں ہوئی تھی۔

مولانا ایوب اصلاحی، حبیب الرحمن کو بہت عزیز رکھتے تھے، اس کے ساتھ مستقل عربی میں ہی گفتگو کرتے، استاذ اور شاگرد کا ایک خصوصی تعلق تھا۔ محادثہ میں مجھے ۱۹ نمبر ملتا تو حبیب الرحمن کو پورے ۲۰ نمبر ملتے۔ عربی کے مضمون میں ہمیں نمبر خوب ملتے تھے، تمام گردانیں ہم طلبہ فرفر سنا دیتے تھے۔ وہاں عربی گردان کا طریقہ دیگر مدارس میں رائج گردان کے نظام سے مختلف تھا، اور یہ طریقہ ہم لوگوں کو آسان معلوم ہوتا تھا۔ منہاج العربیہ الجزء الاول درجہ سوم میں پڑھی تھی۔ درجہ چہارم میں ایوب اصلاحی صاحب روزانہ ہم لوگوں کو اردو میں ایک کہانی لکھواتے تھے جس کا ہمیں عربی میں ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ اور اوپر کی کلاس میں عربی میں لکھواتے تھے جس کا انہیں اردو میں ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح عربی کی اچھی خاصی شُد بُد پیدا ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں درجہ سوم اور چہارم میں اردو اور عربی تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ اس کے بعد یہ مضامین کسی سے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اسی بنیاد پر مطالعے کا سلسلہ پوری زندگی جاری رہا۔

مولانا جلیل احسن ندوی بھی اُس زمانے میں رامپور میں ہی تھے، وہ ثانوی درسگاہ میں استاد تھے۔ مئواره اعظم گڑھ کے انور اعظمی بھی اس زمانے میں رامپور میں تھے۔ وہ ایک بہت معیاری شاعر تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیوسٹی میں فزکس کے پروفیسر اسرار احمد (جنھیں وہاں نیوٹن کہا جاتا تھا) کے وہ بڑے بھائی تھے۔ ان کی ایک چچازاد بہن ہمارے نانھیال کوہنڈا میں بیاہی تھیں۔ میں جب کوہنڈہ جاتا تو وہ اپنے بھائی کی خیریت مجھ سے ضرور معلوم کرتی تھیں۔ میں اکثر انہیں افضل حسین صاحب کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتے دیکھتا تھا۔ ان کا انتقال بڑی کم عمری میں ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں ایک بار سورج گرہن لگا تھا۔ نماز کا وقت متعین تھا، تمام طلبہ بھی مسجد میں جمع ہوئے۔ امانت اللہ صاحب نے کسوف کی نماز پڑھائی، دو رکعت میں سورۃ البقرہ مکمل کی۔ آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے، ان کا حفظ بہت اچھا تھا۔ گونڈہ کے ہونے کی وجہ سے ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ اسلام اللہ پریمی صاحب ان کو رامپور لائے تھے۔ ان کے والد حافظ ہدایت اللہ صاحب کی گونڈہ میں بازار چوک میں گارٹر پان والے سے متصل اسلامی اور دینی کتابوں کی ایک دوکان تھی۔ دینی کتابوں کی دوکان کم ہی چلتی ہے۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن تھے، اُن کی تحریر خوشخط تھی۔ حاجی سمیع کے پرانے

مکان میں کرائے پر رہتے تھے۔اس زمانے میں گونڈہ میں حافظ ہدایت اللہ صاحب کے علاوہ حافظ ابراہیم صاحب، نعیم صاحب سیلز ٹیکس آفیسر، مظفر صاحب (ریلوے ملازم) اور ابا کے شاگرد خاص حاکم علی صاحب وغیرہ جماعت اسلامی کے رکن تھے۔

گنگوہ کے ہارون رشید اور رامپور کے توسل حسین صاحب مرحوم کے بیٹے مزمل حسین بھی ہمارے کلاس میں تھے۔ عمر افضل ہم سے ایک درجہ آگے تھے،ان کے چھوٹے بھائی شمس الہدیٰ کو ٹائیفائڈ اور نمونیا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔وہ ہمارے ہم سبق تھے۔ افضل حسین صاحب کی بہن کا لڑکا افتخار بھی ہماری کلاس میں تھا۔ افضل حسین صاحب کے گھر میں بھی ہم جاتے تھے۔

رامپور میں درجہ چہارم میں ہندی پڑھی تھی۔ ہفتے میں ایک دن املا کے لیے مختص تھا۔ جو لفظ غلط ہوتا تھا اسے ۱۵، بار لکھنا پڑتا تھا۔ املا تحریری صلاحیت کے ارتقاء کے لیے لازمی ہے۔ رامپور میں کھانا تو اچھا ملتا تھا مگر میری صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں چہارم مکمل کرنے کے بعد میرا تعلیمی سلسلہ وہاں جاری نہیں رہ سکا۔اپنے بہترین اساتذہ کی صحبتوں اور ان کے علم وفضل سے محرومی کا احساس زندگی بھر رہا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ان پر اپنا خصوصی فضل فرمائے۔آمین۔[۶]

آخری سفر

وفات سے ایک ماہ قبل ظفر الباری صاحب کی صحت روبہ زوال ہونے لگی تھی۔ گونڈہ شہر کے ڈاکٹروں کے مشورہ سے اُن کے سعادت مند بیٹوں نے ۲۸، اکتوبر کو بہتر طبّی سہولیات کے لیے کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی لکھنؤ میں داخل کیا۔ طبیعت میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ عجیب وغریب آوازیں نکالنے والی مشینوں کے حصار میں مختلف قسم کی طبّی جانچیں، بار بار خون کا نکالا جانا، رنگ برنگ کے انجکشن، انواع واقسام کی انگریزی دوائیں۔ یقیناً تکلیف دہ رہے ہوں گے ہسپتال کے آخری ایام۔ مگر سب کچھ مسکراتے ہوئے اور مستقل گفتگو کرتے ہوئے برداشت کیا۔ان کے بیٹے انجینئر شارق ظفر اکثر پوچھتے پاپا کیا ٹائم ہو رہا ہے؟ تو پورے اطمینان سے اپنی کلائی گھڑی دیکھتے اور بالکل صحیح وقت بتاتے۔ان کے قویٰ مضمحل ضرور ہو گئے تھے مگر آخری وقت میں بھی عزم، حوصلہ اور قوت

---

[۶] محولہ بالا انٹرویو

برداشت میں کمی نہیں آئی تھی۔ ۳؍نومبر ۲۰۲۱ء کی شام کو اِس جہانِ فانی سے عالم آخرت کی طرف کوچ کر گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون (یقیناً ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی جانب لوٹ کر واپس جائیں گے)

چند گھنٹوں کی ضروری کاغذی کاروائی کے بعد ان کا جسد خاکی رات میں ہی گونڈہ لایا گیا۔ جیسے ہی یہ خبر شہر میں پھیلی، احباب، متعلقین، رشتہ دار، شاگرد، پڑوسی اور ہر طبقہ کے معززین اُن کی رہائش گاہ پر جمع ہونے لگے۔ شامیانہ لگا دیا گیا اور کرسیاں بچھا دی گئیں۔ ۴؍نومبر کو ظہر کی نماز کے بعد ۲ بجے فیض آباد روڈ پر توپ خانہ کی مسجد کے پاس راقم خاکسار کی امامت میں سیکڑوں غم زدہ افراد نے نماز جنازہ ادا کی اور تقریباً ۳ بجے شیخ قلعہ کے قبرستان میں اپنے مرحوم فرزند خالد ظفر کے پہلو میں ہمیشہ کے لیے زیر زمین لٹا دیے گئے۔ ۷؍نومبر ۲۰۲۱ء کو دوپہر ۲ بجے مسلم مسافر خانہ گونڈہ میں دیارِ اصغر و جگر کے تحت ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی نظامت معروف اردو صحافی شیخ شمس نے جب کہ صدارت مرحوم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبد الباری علیگ نے کی۔ جلسے میں جماعت اسلامی کے مقامی ذمہ دار ڈاکٹر احمد علی، سابق نگر پالیکا چیئرمین قمر الدین قمر، جگر میموریل کالج کے پرنسپل رفیع اللہ، لکچرر ڈاکٹر بدیع الدین، سماج وادی پارٹی کے قومی ترجمان عمیق جامعی، صدر مسلم عوامی سوسائٹی ذاکر حسین خان، صغیر عثمانی علیگ، انجینئر فیض باری، انجینئر صادق ظفر، طاہر حسین تابش، نجم الاسلام خان عرف نجمی، عاطف گونڈوی، اور مفتی محمد ابراہیم قاسمی نے مرحوم کی خدمات اور خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے حق میں مغفرت کی دعا کی۔

اوصاف و کمالات

ظفر الباری صاحب انتہائی نستعلیق، خوش مزاج اور مجلسی انسان تھے۔ جس محفل میں ہوتے میر بن کر رہتے اور اپنی مدلل علمی گفتگو کے ساتھ پر مزاح شگوفوں اور بذلہ سنجی سے ماحول کو دلچسپ اور خوشگوار بنائے رکھتے۔ علمی تبحّر کا یہ عالم تھا کہ کسی دینی اور تاریخی موضوع پر بات شرع ہو جائے، ان کی گفتگو سے یہ احساس ہوتا کہ معلومات کا ایک سمندر اُن کے سینے میں موجزن ہے۔ عنوان کی تمام تر تفصیلات مع جزئیات بیان کر دیتے۔ قرآن کے علاوہ تاریخی اور فقہی مباحث میں دلچسپی نمایاں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ علمی ذوق رکھنے والے اہل دانش و بینش کے علاوہ علم کے پیاسے اور اپنی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے کے خواہش مند بزرگ و نوجوان ہر عمر کے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ان کے پاس

جاری رہتا۔ خورد و کلاں سب کے ساتھ ان کی سطح، معیار اور مزاج کے مطابق بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔

یادداشت اور مشاہدے کی قوت بہت اچھی تھی۔ رام پور، لکھنؤ اور بھیونڈی وغیرہ میں سکونت کے احوال، بچپن کی خوشگوار یادوں کا تذکرہ اور زمانۂ طالب علمی کے واقعات کی منظر کشی اس طرح کرتے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ ایسی مضبوط یادداشت کا مالک انسان یقیناً گناہوں سے بچنے والا، پرہیز گار اور متقی ہوگا۔ امام شافعیؒ نے اپنے استاذ شیخ وکیعؒ سے اپنی قوت حافظہ میں کمی کی شکایت کہ تو ان کے استاذ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''گناہوں سے بچو، کیونکہ علم اللہ کا نور ہے جو گناہ گاروں کو نہیں دیا جاتا''۔ امام شافعیؒ نے اس واقعہ کو شعر میں بیان کیا ہے۔

شَكَوْتُ اِلٰى وَكِيْعٍ سُوءَ حِفْظِى
فَاَوصَانِىْ اِلٰى تَرْكِ الْمَعاصِىْ
فَاِنَّ الْعِلْمَ نُورٌ مِنْ اِلٰهٍ
وَ نُورُ اللهِ لَا يُعْطٰى لِعَاصٍ

وطن مالوف گونڈہ اور آبائی وطن اعظم گڑھ کی معروف شخصیات کے بارے میں معلومات کا یہ عالم تھا کہ خاندان، حسب نسب اور رشتے داروں تک کے بارے میں جملہ روایات وتفصیلات مع جزئیات سے واقفیت رکھتے تھے، وہ ایک ماہر نسّاب تھے۔ بحیثیت استاد ایک مثالی معلم تھے۔ اپنے مضمون پر مکمل عبور حاصل تھا، کلاس میں سبق کی منصوبہ بندی کرکے جاتے تھے۔ سائنس کے استاذ تھے مگر اردو، تاریخ اور دینیات وغیرہ کے مضامین میں بھی طلبہ کی رہنمائی کرتے اور تقاریر لکھ کر دیتے۔ ان کے درجے میں طلبہ سست اور بوجھل نہیں بلکہ بیدار اور چاق و چوبند رہتے تھے۔ مثالوں اور حوالوں کی مدد سے سمجھانے کا انداز اور طریقہ بہت اعلیٰ تھا۔ کوئی بھی مضمون ہو طلبہ کی دلچسپی آخر تک باقی رہتی۔ اپنے مکان پر برسوں کئی درجن طلبہ کو بغیر فیس کے گھنٹوں ٹیوشن پڑھاتے اور ساتھ میں چائے بھی پیش کرتے۔ صلہ رحمی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ عزیز و اقارب اور رشتہ داروں سے مراسم اور تعلقات کو ہمیشہ مضبوط بنیادوں پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ گرما کی تعطیلات میں قریبی رشتہ داریوں مثلاً کوہنڈہ، گنگا پور گودام، جیگہاں، ڈھلئی فیروز پور، اعظم گڑھ، الہٰ آباد، لکھنؤ، بنارس وغیرہ کا سفر لازماً کرتے اور ہر مقام پر چند روز باقاعدہ قیام کرتے۔ ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ پرانی رشتہ داریوں کو باقی رکھنے کے لیے وہاں بچوں کی شادیاں کر دی جائیں۔ تعلقات کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے رشتہ

طے کرنے کے لیے بھی لوگ ان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

اخلاق و کردار کی بلندی اور اعلیٰ ظرفی کا یہ پہلو بہت نمایاں تھا کہ صرف اہل علم اور صاحب حیثیت افراد کی تکریم نہیں کرتے بلکہ غریب، مزدور، رکشہ والے اور گاؤں کے اَن پڑھ دیہاتی کے ساتھ بھی عزت واحترام کے ساتھ پیش آتے اور تواضع کرتے۔ سرما کے دنوں میں دیہاتی عورتیں بتھوا کا ساگ لے کر آتیں توسب خرید لیتے کہ ان کی مدد ہوجائے اور کھانا کھلا کر ہی رخصت کرتے۔

فکر و نظر میں وسعت تھی اور کشادہ ذہن ودل کے مالک تھے۔ دینی، فقہی اور علمی امور و معتقدات میں مسلمانوں کے کسی مسلک اور مکتب فکر کی اندھی تقلید یا مروجہ روایتی طریقوں کو بعینہٖ اختیار کرنے کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ معاملات و مسائل کو سند اور دلائل کی بنیاد پر جانچنے پرکھنے اور تحقیق و تفتیش کے بعد ایک پختہ رائے قائم کرتے۔ اِس معاملے میں شیعہ اور سنی مسالک کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ چنانچہ متعدد دینی اور تاریخی امور میں امام ابو حنیفہؒ کے استاذ امام جعفر صادقؒ (۸۳ھ - ۱۴۸ھ) کی فقہ اور ان کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ اہل تشیع کی مجالس ہوں یا آبائی سنی مسلک کے اجتماعات، دونوں کے پروگراموں میں تقریر، وعظ اور ذکر وبیان کے لیے تیاری کے ساتھ حاضر ہوتے اور مدلل گفتگو کرتے۔ قرآن کی بنیاد پر مسالک کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے اور فاصلوں کو کم کرنے کی مستقل کوشش کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ۳؍ نومبر ۲۰۲۱ء کو وفات کے بعد جنازہ میں ہر مسلک و مذہب کے عوام کا جم غفیر تھا اور تدفین سے قبل اہل تشیع نے بھی جنازے کی نماز ادا کی۔

استخارہ کی سنت پر اُن سے زیادہ عمل کرنے والا انسان میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہر معاملے میں جس کے اندر مثبت اور منفی، خیر اور شر دونوں پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں، درست فیصلہ تک پہنچنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو استخارے کی تعلیم دی تھی۔ ظفر الباری صاحب استخارہ کے بعد حتمی رائے قائم کرتے تھے۔

مال ومتاع اور اسبابِ عیش و تنعم سے بے نیاز تھے۔ ہمیشہ مطمئن اور شاداں وفرحاں۔ سادگی، قناعت اور خلوص کے پیکر، سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ محلہ کے غریبوں، یتیموں، مظلوموں، اور بیواؤں کی نگرانی اور نگہبانی کرتے، بعض مستحقین کو اپنے گھر میں ٹھکانہ دیا۔ بلا تفریق مذہب وملت ایسے مرد وخواتین کی مستقل امداد اور تعاون کرنا ان کی عادت تھی۔

اخبار علمیہ

قرآن مجید کے نادر نسخوں کا ہدیہ

شارجہ کے حکمراں نے قرآن مجید کے ۹۳ نادر اور قدیم نسخے مجمع القرآن الکریم، شارجہ (متحدہ عرب امارات) کو ہدیہ کیا ہے۔ ان کی اس علم دوستی اور کرم نوازی پر ادارہ کے سکریٹری جنرل شیخ شیر زاد عبدالرحمن ظاہر نے کہا کہ حاکم شارجہ کی جانب سے مجمع کو عظیم علمی تحائف عطا کرنے کا ایک دیرینہ سلسلہ ہے۔ اس سے ادارے کے ساتھ ان کی لا محدود محبت وحمایت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس بار قرآن مجید کے جو ۹۳ نادر نسخے عطا کیے گئے ہیں انہیں عہد مغلیہ کے اواخر سے عصر حاضر تک کے مختلف تاریخی ادوار میں جمع کیا گیا ہے۔ ان کی عمریں تین سے چھ سو سال کے درمیان کی ہیں اور انہیں دنیا کے مختلف ممالک اور علاقوں سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ بایں طور کہ اس میں کشمیری، ہندی، بخاریٰ، افغانی، عربی، مغل، قاچاری اور ایرانی مصاحف شامل ہیں جو زیادہ تر منقش، مذہب اور مختلف رسم الخط مثلا بہاری، خط ثلث اور خط نسخ میں لکھے گئے ہیں۔ ہندوستان کے عظیم مغل بادشاہ شاہ عالم کے عہد کا وہ نایاب اور مذہب نسخہ بھی ہے جو سلطان کی تخت نشینی کی مناسبت سے لکھا گیا تھا۔ اس پر خطاط محمد قاسم العمر کے قلم سے ۱۰۱۶ھ کی تاریخ درج ہے۔ اس مجموعے میں میر محمد جعفر، ملا ابرہیم، قادر بن محمد خوارش، غلام حسین سید عالم، محمد فاضل بن محمد اور حافظ نظام جیسے عظیم خطاطوں کے تحریر کردہ نایاب نسخے بھی ہیں۔ اس میں قدیم لیتھو پریس پر مطبوعہ نسخے بھی ہیں۔ ان کے علاوہ مذہب و منقش آٹھ خطی قرآنی تختیاں اور قرآن کی طباعت کا ایک حجری سانچہ بھی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مجمع میں محققین اور تکنیکی ماہرین کی خصوصی کمیٹیوں نے قرآن حاصل کرنے کے فورا بعد انہیں آرکائیو کرنے، دستاویزی شکل دینے، درجہ بندی کرنے، تصویر کشی (ڈیجیٹائزڈ) کرنے، ان کی موجودہ حالت کا جائزہ لینے اور ان کی بحالی پر کام شروع کر دیا ہے۔ کیمیائی علاج اور جراثیم کشی کے لیے انہوں نے قاسمیہ یونیورسٹی میں مخطوطہ ہاؤس کی جدید سائنسی لیباریٹریز کا تعاون بھی لیا ہے۔ ان تمام نسخوں کو اسکین کرنے اور انہیں الکٹرانک شکل دینے کے بعد عام مصنفین وماہرین اور شائقین کے ہمہ وقت استفادہ کے لیے مجمع کی ویب سائٹ پر بھی ڈالا جائے گا۔ اس کے علاوہ مجمع کے میوزیم میں آنے والے زائرین ان مصاحف کی براہ راست زیارت

بھی کر سکیں گے۔(الشارقہ الاخبار ۲۲-۶-۲۲ء)

۱۶۰ برس قدیم لائبریری کی تجدید و بحالی

الٰہ آباد شہر کے چندر شیکھر پارک میں واقع پبلک لائبریری ۱۶۰ سال سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ عمارت برطانوی فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ قدامت کے سبب عمارت مخدوش ہو گئی ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق اب اسے ٹرسٹ فار آرٹ اینڈ کلچرل ہیریٹیج (INTACH)، نئی دہلی کی نگرانی میں پانچ کروڑ کے صرفہ سے اسمارٹ سٹی پروجیکٹ کے تحت بحال کیا جائے گا۔ بحالی کا کام لائبریرین گوپال موہن شکلا کی برسوں کی مسلسل کوششوں اور اسمارٹ سٹی پروجیکٹ کے چیر مین ڈیویژنل کمشنر سنجے گوئل اور انٹیک کے کنزرویشن آرکیٹک دیویا کمار کے فعال تعاون کا نتیجہ ہے۔ مسمار شدہ حصہ کی جگہ ہو بہو بالکل ویسا ہی ڈھانچہ بنایا جائے گا۔ شمال مغربی صوبہ کے دارالحکومت کو آگرہ سے الٰہ آباد (اب پریاگ راج) منتقل کرنے پر اس وقت کے سکریٹری صدر بورڈ آف ریوینیو جی ایچ ایم ویٹیان نے حکومت کی توجہ لائبریری کی طرف مبذول کرائی اور دارالحکومت میں ایک لائبریری کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جسے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر نے ۱۸۸۳ میں منظور کیا تھا۔ یہ عمارت گوتھک آرٹ کے مجسمہ کی ایک شاندار مثال ہے۔ اسے چنار پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کا ڈیزائن (نقشہ) آر راسکیل بے نے تیار کیا تھا۔ اس عمارت کا اصل نام Thornhil-Mayene Memorial ہے۔ ایوان بالا کی پہلی نشست یوپی کے نام سے شمال مغربی صوبوں کے لیے قانون ساز کونسل اودھ ۸ جنوری ۱۸۸۷ء کو ہوئی اور اس کے بعد ۱۹۰۰ تک مذکورہ ایوان کی نشستیں اسی عمارت کے ہال میں منعقد ہوئیں۔ اس لائبریری کی پہلی صد سالہ تقریب ۱۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو اس وقت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی موجودگی میں منائی گئی تھی۔ (ٹائمس آف انڈیا، وارانسی ۱ جون ۲۲ء ص ۳)

ک۔ ص۔ اصلاحی

وفیات

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی

(۱۹۲۶-۲۰۲۲)

ملک کے معروف عالم دین اور اہل قلم مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کا دہلی میں ۲۲، جنوری ۲۰۲۲ کو انتقال ہو گیا۔ مولانا سنبھلی مولانا منظور احمد نعمانیؒ کے فرزند اکبر اور اپنی ذاتی حیثیت میں مفسر قرآن اور بہت منجھے ہوئے اہل قلم تھے۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ میں جب میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں طالب علم تھا تو ان دونوں عظیم حضرات سے میری شناسائی تھی۔ مولانا منظور نعمانیؒ بہت شفقت فرماتے تھے اور دعائیں دیتے تھے۔ مولانا نعمانیؒ ایک بار ندوہ میں والد صاحب کے کمرے کے پاس سے گذر رہے تھے جہاں میں ایک اخبار دیکھ رہا تھا۔ رک گئے اور پوچھا کہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ اخبار ''دعوت'' میں میرا ایک مضمون چھپا ہے، اسی کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی آیا ہے۔ انھوں نے وہ اخبار مجھ سے لیا اور اس مضمون کو پڑھا جو امریکہ کے کالے مسلمانوں کے بارے تھا۔ بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور تلقین کی کہ لکھا کریں، ان شاء اللہ بڑی کامیابی ملے گی۔

لکھنؤ میں مولانا سنبھلی کو میں نے ذرا کم ہی دیکھا اور وہ اس وقت چند لمحات کے لئے ہوتے تھے جب میں والد صاحب (مولانا وحید الدین خانؒ) کا کوئی مضمون دینے ''الفرقان'' کے آفس میں جاتا جس کے وہ مدیر تھے۔ کنڈی کھٹکھٹانے پر خود باہر تشریف لاتے، خط اور منسلکہ مضمون پر ایک نظر ڈالتے اور خاموشی سے اندر چلے جاتے۔ وہ بہت کم گو اور خاموش طبیعت کے انسان تھے لیکن نجی محفلوں میں ضرور بولتے اور محفل کو دلچسپ رکھنے کے لئے بذلہ سنجی کا بھی مظاہرہ کرتے۔

اس کے بعد مولانا سنبھلی سے میری کچھ ملاقاتیں لندن میں ہوئیں جہاں وہ غالباً ۱۹۶۷ میں منتقل ہو گئے تھے جس وجہ بظاہر خرابیٔ صحت بتائی گئی۔ سنہ ۱۹۷۹ء میں، میں بھی لندن منتقل ہو گیا اور ۱۹۸۴ کے آخر تک مقیم رہا۔ اس عرصے میں مولانا مرحوم سے چند بار ملاقات ہوئی۔ اسی عرصے میں ایک بار مولانا کا ساتھ ایران کے لمبے سفر میں بھی رہا جو غالباً ۱۹۸۱ یا ۱۹۸۲ میں ہوا۔ جگہ جگہ لوگ جوق در جوق ہماری بس کو گھیر لیتے تھے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک موقعہ پر مولانا نے کہا: ''آپ لوگ تو ہم سے اتنا قریب ہونا چاہتے ہیں اور ہم ہیں کہ آپ سے دور بھاگتے ہیں''۔ بعد میں مجھے اطلاع ملی کہ ایران کے اس سفر اور بعض دوسری معتدل تحریروں کی وجہ سے لندن میں دیوبندی حلقے میں مولانا پر تنقید

ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ باتیں میں نے دوسروں سے سنی ہیں، خود انھوں نے اس بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اس عرصے میں انھوں نے واقعہ کربلا اور انقلاب ایران کے بارے میں بھی کتابیں لکھیں جو ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی غماز تھیں۔

مولانا مسلم مجلس مشاورت کے اُن ۷۹ بانی ممبران میں سے تھے جو مشاورت کے پہلے اجتماع منعقدہ لکھنؤ (اگست ۱۹۶۴) میں شریک تھے۔ ۲۰۱۵ میں، جب میں مسلم مجلس مشاورت کا صدر تھا، مشاورت کی پچاس سالہ سالگرہ منائی گئی۔ اس موقعے پر جو تاسیسی ممبران تاحیات تھے، ان سے رابطہ کر کے میں نے ان سے اس تاریخی اجلاس میں شرکت کی درخواست کی۔ مولانا مرحوم نے خرابیٔ صحت کی بنیاد پر دہلی آنے سے معذرت کرلی۔ اس موقعے پر مشاورت کی طرف سے ایک خصوصی شیلڈ ان کو پیش کی گئی جو دہلی میں مقیم ان کے صاحبزادے عبید الرحمن سنبھلی نے ان کی نیابت میں قبول کی۔

آپ کی اہم ترین تصنیف ''محفل قرآن'' (۶ جلدیں) ہے جو آپ کے مطالعۂ قرآن کا نچوڑ ہے۔ دوسری اہم کتابوں میں ''حیات نعمانی'' بھی شامل ہے جو انھوں نے اپنے والد بزرگوار مولانا منظور نعمانیؒ کے بارے میں لکھی ہے۔ متعدد اور کتابوں کے علاوہ ان کے ہزاروں مضامین بھی مختلف پرچوں خصوصاً ''الفرقان'' میں چھپے ہوئے ہیں جن میں سے بعض کی اشاعت کتابی صورت میں ہوگئی ہے۔ جو باقی ہیں ان کو بھی کتابی صورت میں محفوظ کرنا چاہئے۔

چند سال قبل وہ لندن سے دہلی منتقل ہوگئے تھے اور اپنے بیٹے کے پاس مالویہ نگر میں رہنے لگے تھے۔ خواہش کے باوجود دہلی میں رہتے ہوئے بھی میں ان سے کبھی دوبارہ ملاقات نہیں کر سکا، جس کا افسوس مجھے ہمیشہ رہے گا۔ اللہ پاک ان کی قبر کو نور سے بھر دیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات میں جگہ دیں (ڈاکٹر ظفر الاسلام خان)۔

تبصرۂ کتب

مشائخ الامام الاعظم (عربی): از مولانا عبدالستار معروفی، تحقیق ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۶۱۰۔ قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس احیاء المعارف، جامعۃ الصالحات، مالیگاؤں ضلع ناسک، مہاراشٹر، پن کوڈ: ۴۲۳۲۰۳۔ سال اشاعت ۲۰۲۰ء

اس نہایت قابل قدر کتاب کے مولفؒ ہندوستان کے ان مشائخ حدیث میں ہیں جن کی ساری زندگی علم و فن حدیث شریف کے درس وتدریس کی خدمت میں گزری، ان کا شمار ان شیوخ حدیث میں بھی ہوتا ہے جو عام شور و شہرت سے بے نیاز رہے۔ وہ اس لیے بھی امتیازی شان رکھتے تھے کہ شیخ الکل میاں نذیر حسین کے مداح اور ان کے اقوال کے قائل ہوتے ہوئے امام ابوحنیفہ کی محدثانہ شان کے بڑے قائل تھے، ایک مخصوص ماحول میں جہاں امام صاحب کو علم حدیث میں بڑا درجہ نہ دیے جانے کا رجحان رہا، اس کے پیش نظر مولانا عبدالستار معروفی ہمیشہ مضطرب رہتے تھے، وہ امام صاحب کے شیوخ حدیث پر خاص نظر رکھتے اور شاگردوں کے سامنے طرح طرح سے اس کے مختلف زاویوں کو پیش کرتے، ان کے مخصوص شگفتہ طرز گفتگو میں یہ احساس پنہاں بھی رہتا اور عیاں بھی کہ امام صاحب کی حدیث وسنت میں عظمت وامامت سے دانستہ اعراض کیا گیا۔ علامہ شبلی کو اس کا افسوس تھا کہ جن کتابوں میں امام صاحب کے شیوخ کا پورا پورا استقصاء کیا گیا وہ ان کی نظر سے نہیں گزریں۔ مولانا معروفی کی زیر نظر تحقیق میں شاید یہی جذبہ رہا کہ اب کتابیں پہلے سے زیادہ موجود و متداول ہیں۔ اس لیے ان کے استقصاء کا عمل اب پورا کیے جانے کا وقت ہے۔ یہاں علامہ شبلی کا یہ جملہ دہرانا شاید بے محل نہ ہو کہ ”سچ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے لیے کثرت شیوخ اس قدر فخر کا باعث نہیں جتنا ان کی احتیاط اور تحقیق ہے“۔ امام صاحب اس نکتے سے خوب واقف تھے کہ روایت میں جس قدر واسطے زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔ بہر حال شیخ الحدیث حضرت معروفی نے دارالعلوم مئو سے دارالعلوم ندوۃ العلماتک حدیث شریف کے درس میں امام ابوحنیفہ کے تعلق سے اپنے تحقیقی مطالعات کا یہ مجموعہ اس تفصیل سے مرتب کردیا کہ اب شاید ہی اس موضوع سے تشنگی کا احساس ہو، انہوں نے تین سو اکتالیس شیوخ حدیث کا تذکرہ اس طرح کیا کہ کتاب کو رجال کی کتب متقدمین کے درجہ تک پہنچادیا۔ یہاں علامہ شبلی کی بات یاد آتی ہے کہ ابوحفص کبیر کے دعوی کے مطابق امام صاحب کے کم از کم چار ہزار شیوخ حدیث تھے لیکن انصاف یہی ہے کہ یہ دعوی محدثانہ اصول پر ثابت نہیں ہو سکتا،

اس کتاب نے بہر حال جو ثابت کیا وہ محدثانہ اصول ہی کے مطابق ہے، معلوم ہوا کہ شیخ معروفی کی تین اور کتابیں شرح سنن الترمذی، تلامذہ الامام ابی حنیفہ اور کتاب فی مسئلہ القرآۃ خلف الامام بھی ہیں یہ سب غیر مطبوعہ ہیں، پیش نظر کتاب بھی شاید غیر مطبوع رہتی اگر اس کی تحقیق و تدوین کا فریضہ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے انجام نہ دیا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذہن و قلم دونوں تحقیق و تخریج و تعلیق سے بخوبی ہم آہنگ ہے، اس کا اندازہ اس کتاب کے صفحہ صفحہ سے کیا جا سکتا ہے، اس نہایت دیدہ زیب کتاب کے ناشر مولانا ہلال احمد رئیس مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں کی تحریر کے علاوہ دار العلوم دیوبند کے رئیس شعبہ حدیث شیخ نعمت اللہ معروفی اور دیوبند ہی کے مہتمم مولانا ابوالقاسم نعمانی کی تحریروں کے ساتھ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کے صاحبزادے شیخ سلیمان کی بھی تحریر ہے۔ فاضل مرتب نے مولف علام کے سوانح اور کتاب کی اشاعت کے مراحل کا بھی ذکر کر دیا، معنوی لحاظ سے کتاب جتنی دلکش ہے، گرد پوش اور سرورق کا حسن اس سے بالکل کم نہیں۔ ع۔ص

دیباچۂ مکاتیب غالب امتیاز علی خاں عرشی: مرتبین : ڈاکٹر زہرہ عرشی (مرحومہ)، ڈاکٹر ثاقب عمران۔ کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۱۲، ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی، مکتبہ ضیاء الکتب خیر آباد، مئو۔ قیمت :۱۸۶ روپے۔ سن طباعت : ۲۰۲۱ء۔ موبائل نمبر: ۹۸۹۱۴۲۳۲۱۶

اردو مکتوب نگاری میں غالب انوکھے طرز تحریر کے بانی اور منفرد مقام پر فائز ہیں۔ ان کے فن مکتوب نگاری پر درجنوں مضامین اور کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ غالب شناسوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا شمار صف اول کے ماہرین غالبیات میں ہوتا ہے۔ غالب کے ممتاز مرتبہ شناسوں کی مختصر ترین فہرست کی تکمیل مولانائے مرحوم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کی اہم وجہ ۱۹۳۷ء میں مکاتیب غالب کی ابتدائی ترتیب و تدوین اور مکتوباتی ادب پر اپنی نوعیت کا یہی پہلا کام ہے۔ اس کو حسن قبول حاصل ہوا اور بہت کم وقت میں متعدد ایڈیشن نکلے۔ اس پر مولانا کے قلم سے ایک بسیط و پر مغز دیباچہ (مقدمہ) ہے۔ عام سوانح غالب سے قطع نظر اس میں انشائے غالب پر تبصرہ اور اس مجموعہ میں شامل خطوط کی محققانہ تفصیل، دربار رامپور سے غالب کے تعلقات کے اہم استقصا واضافہ نے خاص طور سے اہل علم کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی اور شیدایان غالب پہلی بار مکاتیب غالب کے مجموعوں اور ان کی اشاعت کی تاریخ اور اس قسم کی نئی معلومات سے واقف ہوئے تھے۔ آج بھی اس دیباچہ کی اہمیت وافادیت سے انکار مشکل ہے۔ چونکہ مکاتیب غالب ۱۹۴۹ء کے بعد آج تک شائع نہ

ہو سکی ہے۔ عدم اشاعت کی اس طویل مدت کے سبب یہ کتاب بالخصوص اس کا دیباچہ عام استفادہ ودسترس سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ ڈاکٹر زہرہ عرشی (مرحومہ) اور ڈاکٹر ثاقب عمران اہل علم کے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے قند مکرر کے طور پر دیباچہ کو کتابی شکل میں الگ سے مرتب کر کے طبع کرانے کی ضرورت محسوس کی۔ ڈاکٹر عرشی مرحومہ کے انتقال کے سبب اس کتاب کی تدوین وترتیب اور تقدیم کا مکمل فریضہ ڈاکٹر ثاقب ہی نے انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر ثاقب عمران اس سے قبل مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی غالب شناسی پر ایک کتاب مرتب کر چکے ہیں۔ انہیں ترتیب وتدوین کا اچھا سلیقہ ہے۔ انہوں نے اس دیباچہ پر تقریباً ۵۸ صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ لکھا۔ شروع میں فن مکتوب نگاری کا ناقدانہ و محققانہ جائزہ لینے کے بعد غالب کے معاصرین کے مکاتیب اور خود غالب کی خطوط نویسی کے خصائص وامتیازات پر اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کی روشنی میں عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ خطوط غالب کے بیشتر مجموعوں میں شامل خطوط کی تعداد، سنہ اشاعت، مطبع اور ان کے مرتبین کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں مکاتیب غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی کی انفرادیت دکھائی ہے۔ خطوط غالب کے اس اہم مجموعہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ مولانا عرشی کی حیات تک اس کے جو ایڈیشن نکلے ان میں انہوں نے حسب ضرورت وموقع اضافے بھی کیے۔ اس کا تذکرہ ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ مرتب نے ان بیانات پر انحصار واکتفا کے بجائے تصدیق کے لیے اصل سے ان کا موازنہ ومقارنہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں ''میں نے ان دونوں نسخوں کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ امتیاز علی عرشی کا قول کہاں تک درست ہے''؟۔ (ص ۷۱) چنانچہ موازنہ کے بعد مولانا عرشی کے حک واضافہ کی متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس سے مرتب کے احساس دیانت وذمہ داری کا علم ہوتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں زبان وبیان میں جھول اور بعض جملوں میں اسقام وابہام بھی نظر آیا۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''ان مکاتیب کے منظر عام پر آجانے سے غالب کی زندگی کا ایک اہم حصہ منظر عام پر آگیا۔'' (ص ۷۶) یا یہ جملہ ''مدارج تحقیق کی تمام تر دقتوں کے باوجود میری یہ کوشش رہی ہے کہ یہ کتاب علم وادب کی دنیا میں کسی قسم کا اضافہ ثابت ہو جائے یا کم از کم اپنی اہمیت کے پیش نظر کوئی مقام حاصل کرلے''۔ (ص ۷۶) قارئین ان سطور میں موجود نقص اور جھول کا اندازہ بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ ان معمولی کمیوں کے باوجود قاری مرتب کی محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اسلام امن وسلامتی کا راستہ پروفیسر اختر الواسع۔ کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۱۵۲ ملنے کا پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، حوض سوئی والان، نئی دہلی۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ ای میل: Ibookfoundation@gmail.com ۔

اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے لیکن فی زمانہ جس طرح اس کو قابل نفریں بنانے، اس کے متبعین کو بدنام اور ان کا عرصۂ حیات تنگ کرنے کی سازشیں اور طرح طرح سے ان کے صبر وضبط کا امتحان لینے کی کوششیں کی جارہی ہیں اس سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ نیک طبع اور انصاف پسند غیر مسلموں کے دل بھی مجروح ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ ملک عزیز کے بعض نام ور ہندو صحافیوں اور دانشوروں کے خیالات اور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ان کے بیانات سے ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ سلسلہ رکے اور اسلام کی پر امن ہدایت و تعلیم اور اس کی اصل تصویر لوگوں کے سامنے آئے۔ زیر نظر کتاب دراصل ہندی اخبار ''نیشنل دنیا'' کے مدیر اور مشہور صحافی شری کمار آنند کی تحریک پر ہر ہفتہ لکھے گئے اسلام کے کسی بنیادی موضوع سے متعلق پانچ سو الفاظ پر مشتمل کل ۴۸ مختصر مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ پہلے ہندی میں منظر عام پر آئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ بعد میں مؤلف کے احباب کے اصرار پر اردو میں طبع ہوئی۔

اسلام کیا ہے ؟ مسلمان کون؟ اسلامی عبادات بالخصوص نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے علاوہ سیرت رسول ﷺ کے تابندہ نقوش، قرآن کی تعلیمات، حدیث، فقہ، تصوف، اسلام میں والدین، بچوں، پڑوسیوں، عورتوں اور عام انسانوں کے حقوق، اسلام کے سیاسی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی، ازدواجی نظام، عدم تشدد، خانگی تشدد، اسقاط حمل، ہم جنس پرستی، نشہ آور اشیا کا استعمال، ماحولیاتی تحفظ اور کیا اسلام جدت و تبدیلی کا مخالف ہے؟ جیسے عام اور متداول موضوعات و عناوین پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کا مقصد بنیادی طور پر اسلام سے ناواقف و کم آشنا برادران وطن کو اس کی لازوال خوبیوں اور پر اثر حقائق سے متعارف کرانا ہے۔ مصنف بلا شبہہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہیں۔

مصنف ایک دیدہ ور اور ممتاز اسکالر کے منصب پر فائز سمجھے جاتے ہیں۔ خطابت ان کا خاص جوہر ہے۔ ان کے اس وصف کا اثر ان کی اس کتاب پر بھی نمایاں ہے۔ محدود لفظوں میں اطمئنان بخش اور سیر حاصل معلومات پروسنے میں انہوں نے اپنی دیرینہ تصنیفی و تالیفی لیاقت و تجربہ سے بھرپو فائدہ اٹھایا ہے۔ مصنف کے بعض خیالات سے عدم اتفاق اپنی جگہ لیکن انہوں نے ان موضوعات پر جامع، دلنشین، دوٹوک اور واضح انداز میں گفتگو اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق اسلام کے تعلیمی، معاشی، اخلاقی، معاشرتی نظام اور انسانی حقوق سے ہے اور جن کی پامالی کا اغیار کی جانب سے الزام لگایا جاتا ہے۔

ک۔ ص۔ اصلاحی

ادبیات

نعت

وارث ریاضی

کاشانۂ ادب۔ سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن۔ بہار۔845453

موبائل: 8228902548

(اسی نعت کی زمین میں ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کی ایک فکر انگیز نعت سے متاثر ہو کر)

زندگی میری گزرتی ہے بڑی شان کے ساتھ
ربط محکم ہے مرا حاملِ قرآن کے ساتھ

آپ ہیں داعیِ دیں، قاسم علم و عرفاں
ہے رسالت پہ یقیں آپ کی، برہان کے ساتھ

فیض سے آپ کے ایمان کی دولت ہے نصیب
میں تو زندہ ہوں فقط آپ کے احسان کے ساتھ

آپ تو سارے زمانے کے لیے رحمت ہیں
آپ سب پر ہیں مہربان دل و جان کے ساتھ

آپ سے پہلے اخوت نہ تھی ناپید مگر
ایسی الفت نہ تھی انسان کو انسان کے ساتھ

آپ سے شرف غلامی مجھے حاصل ہے حضور!
میں تعلق نہیں رکھتا کسی خاقان کے ساتھ

آپ کی ذات گرامی سے جہاں کے محسن!
طالبِ لطف و کرم ہوں بڑے ارمان کے ساتھ

آپ سے حشر کے دن، آپ کی مدحت کے طفیل
آرزو ہے کہ ملوں حضرتِ حسانؓ کے ساتھ

ہے یہی دل کی تمنا کہ نبیِ مرسل!
پہنچوں فردوس میں توحید کے سامان کے ساتھ

آپ کی راہِ ہدایت پہ ہے قائم وارث
خاص رغبت ہے اسے آپ کے فرمان کے ساتھ

امام غزالی

وارث مظہری

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

wmmazhari@jamiahamdard.ac.in

اے کہ تیری ذات والا مطلعِ چرخِ کمال
اے کہ تیرے علم سے پیدا شرارِ جستجو

اے کہ تیرے کلکِ فن سے فاش اسرار وجود
اے کہ تیری فکر شرحِ کائناتِ رنگ وبو

تیری ''مُنقذ'' سے یہ میری عقل پر عقدہ کھلا
سرخیِ عنوانِ فہمِ دین ہے دل کا لہو

امتزاجِ عقل ودیں ہے فکرِ ملت کی اساس
خارہائے شک میں گلہائے یقیں کو ہے نمو

کاشفِ رمزِ شریعت تیری فہمِ پردہ سوز
دین کی تفہیم کا حاصل ہے تیری گفتگو

آکہ ہے گم گشتگانِ رہ کو پھر تیری تلاش
رہزنانِ شوق ہیں، آشفتہ سر، شوریدہ خو

ہے جہانِ فکر میں تیرے قلم سے اضطراب
آہ! کس ویران خانے میں ہے پڑا سوتا ہے تو

کس طرح بے خود پڑے ہیں میکدے میں غیر کے
دیکھ! یہ پیروجواں، مخمور بھی، ہشیار بھی

ہے خلل شور ''تہافت'' سے خرد کی بزم میں
دے رہے ہیں طعن یہ، احباب بھی اغیار بھی

ہے تری ''احیائے دیں'' کی دھار مرجھائی ہوئی
کھو گیا تیرے قلم کا جوہر کردار بھی

آکریں پیدا معانی کی نئی اک کہکشاں
آکہ خشتِ کہنہ سے، تازہ جہاں پیدا کریں[1]

---

[1] ۲۰۱۰ میں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے میرا، تہران کا سفر ہوا۔ اس موقع پر ''طوس'' میں امام غزالیؒ کی قبر پر بھی

غزل

جمیل مانوی

سہارنپور

مائل بہ کرم ہے کوئی بے گانہ ادا بھی
مل جائے گا اب دل کو وفاؤں کا صلا بھی

حاصل مجھے دنیا بھی ہے دنیا کے سوا بھی
ہر رنگ طبیعت میں ہے اچھا بھی برا بھی

ہر چند زمیں پر ہیں قدم، دل سر افلاک
اور یوں مرے امکان میں شامل ہے خطا بھی

یہ سوچ کے مہمان کیا تھا تجھے گھر میں
شاید کہ بدل جائے مرے گھر کی فضا بھی

دکھ کیوں مری تقدیر کے ٹالے نہیں ٹلتے
تم لطفِ سراپا بھی ہو پابند وفا بھی

آ دیکھ مری عمرِ تمنا کا تماشا
یہ داغ ہیں یہ دل ہے یہ کچھ دل کے سوا بھی

یہ چاہوں کہ تم ٹوٹ کے چاہو مجھے اک بار
دل دیکھ تو لے اپنی محبت کی جزا بھی

اب عقل سلامت ہے نہ ایمان سلامت
دنیا ترے دھوکے میں بھلا بھی ہے برا بھی

مایوس نہ ہو صبح کے آثار ہیں پیدا
پھر نور سے بھر جائے گی دھرتی بھی فضا بھی

دنیا کو پھر اک بار سنورتے ہوئے دیکھوں
پھر سونپ ارادوں کو مرے من کی صدا بھی

حاضری ہوئی۔ یہ نظم اسی تاثر کے تحت بعد میں لکھی گئی۔ بعض اشعار میں غزالی کے فلسفہ شک، عقل و نقل میں ہم آہنگی کی ضرورت اور حقیقت اعلیٰ تک رسائی کے لیے عقل کی بجائے وجدان یا دل کو ترجیح دینے کے ان کے فلسفے کی طرف اشارہ کیا گیا۔ ''منقذ''، ''تہافت'' اور ''احیائے دین'' سے غزالی کی کتابیں: منقذ من الضلال، تہافت الفلاسفہ اور احیاء علوم الدین مراد ہیں (وارث)۔

معارف کی ڈاک

مولانا کامل صاحب ولید پوری

جون کے معارف میں پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی صاحب کا مضمون نظر سے گذرا اور اس سے مفید معلومات حاصل ہوئیں، اس مناسبت سے خیال آیا کہ ابھی حال ہی میں علامہ شبلی اور ان خاندان کی اس علاقہ کے ایک بزرگ سے وابستگی کا ذکر نظر سے گذرا ہے وہ معارف کے ذریعہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

مولانا کامل صاحب ولید پوری ولید پور ضلع اعظم گڑھ (موجودہ ضلع مئو) کے مشہور بزرگ ہیں، ان کے حالات میں ان کے سلسلہ کی ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ "عارف باللہ حضرت شاہ جعفر علی فریدی ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ صاحب سلسلہ بزرگ ہوئے ہیں، مولانا کے کئی خلفاء نے عرب شریف جاکر رشد و ہدایت کی، مولانا نے علامہ شبلی نعمانی کا نام شبلی اور ان کے بھائی کا نام جنید رکھا، اور علم کے حصول کی دعائیں کیں، علامہ شبلی کے والد بزرگوار شیخ حبیب اللہ صاحب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت شیخ الٰہی بخش صاحب ساکن صبر حد ضلع جونپور کے مخلص مرید تھے۔........ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی خلیفہ و داماد حضرت چراغ ربانی (مولانا کامل صاحب) نے علامہ شبلی کو نعمانی کے خطاب سے نوازا تھا" (تذکرہ آبادانیہ از مولانا انور علی فریدی، ص ۲۰۰)۔

مولانا کامل حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد میں ہیں اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھتے تھے عجب نہیں کہ نعمانی کا لقب دینے ان کے داماد مولانا فاروق کے پیش نظر یہ نسبت بھی رہی ہو۔

سید صاحب کے پیش نظر یہ اطلاع نہ تھی اس لئے انہوں نے حیات شبلی میں قیاساً لکھا کہ شاید ان کے والد کو تصوف کا ذوق ہو گا اس لئے دونوں بیٹوں کا نام شبلی و جنید رکھا۔

طلحہ نعمت ندوی
talhanemat3@gmail.com

(۲)

شاہ منیر عالم غازی پوری

جون کا معارف ملا۔ سبھی مندرجات ماشاءاللہ بہتر ہیں۔ اگرچہ خط خفی ہو گیا ہے۔ خیر پھر بھی پڑھ لیتا ہوں۔ پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی صاحب کا مقالہ شاہ منیر عالم غازی پوری اور علامہ شبلی کی آخری

سطروں نے متوجہ کیا: ''ان سے متعلق مزید معلومات کی فراہمی کے لیے یہ عاجز راقم ''معارف'' کے قارئین کرام کا ممنون ہوگا''۔ شاہ منیر عالم صاحب کے بھائی شاہ محمد ظہیر عالم ڈپٹی کلکٹر کی صاحبزادی فاطمہ کی شادی سر شاہ سلیمان سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وجج فیڈرل کورٹ آف انڈیا متوفی ۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء سے ہوئی تھی جو کہ شاہ غیاث عالم کی حقیقی بہن تھیں۔ شاہ غیاث عالم صاحب کا ذکر مذکورہ مقالے کے آخری صفحے پر ہے۔ مزید یہ کہ شاہ اویس عالم صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ملازم تھے۔ یہ عنایت شاہ غیاث عالم صاحب کے چچیرے بھائی تھے۔

شاہ ظفر الیقین

گیان پور

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبروار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ/صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین ومقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

رسید کتب موصولہ

اُداس نظمیں : جناب پرویز مظفر، مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، مظفر حنفی لین، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی، صفحات ۱۲۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۱۵۰روپے۔

اسلام پر بے جا اعتراضات : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور، صفحات ۸۰۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۶۰۰روپے۔

بیان شبلی(۲): ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ، صفحات ۲۲۴ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰روپے۔

تاریخ کعبہ: عبدالوکیل بن عبدالعزیز انصاری، رازی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات ۲۵۰ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۵۰۰روپے۔

حضرت مولانا ابو سلمہ شفیع احمدؒ (مضامین کا مجموعہ): طلحہ بن ابو سلمہ ندوی، ادارہ ترجمہ وتالیف، سر سید احمد روڈ، کولکاتا۔ صفحات ۳۵۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت درج نہیں۔

عکسِ خیال (افسانے): محترمہ نفیسہ سلطانہ انا۔ فضا ٹورز اینڈ ٹریولس، نیو تاج مارکیٹ بھوپال۔ صفحات ۱۶۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت ۲۰۰روپے۔

متاع فکر و نظر: مولانا محمد اسعد قاسمی، جامعہ عربیہ امدادیہ، مرادآباد، صفحات ۳۲۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۳۰۰روپے۔

مظفر حنفی : حیات وجہات : انجینئر فیروز مظفر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ صفحات ۳۵۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت: ۳۵۰روپے۔

مظفر کے نام (کچھ ادبی خطوط): انجینئر فیروز مظفر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ صفحات ۵۹۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۵۰۰روپے۔

نقش تابندہ (شعری مجموعہ) : جناب وفا صدیقی، اقبال لائبریری، اقبال میدان، بھوپال ۔ صفحات ۱۶۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت: ۳۰۰روپے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print **AUG 2022** Vol. 209/8

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات